جی ہاں ریٹے ہیں

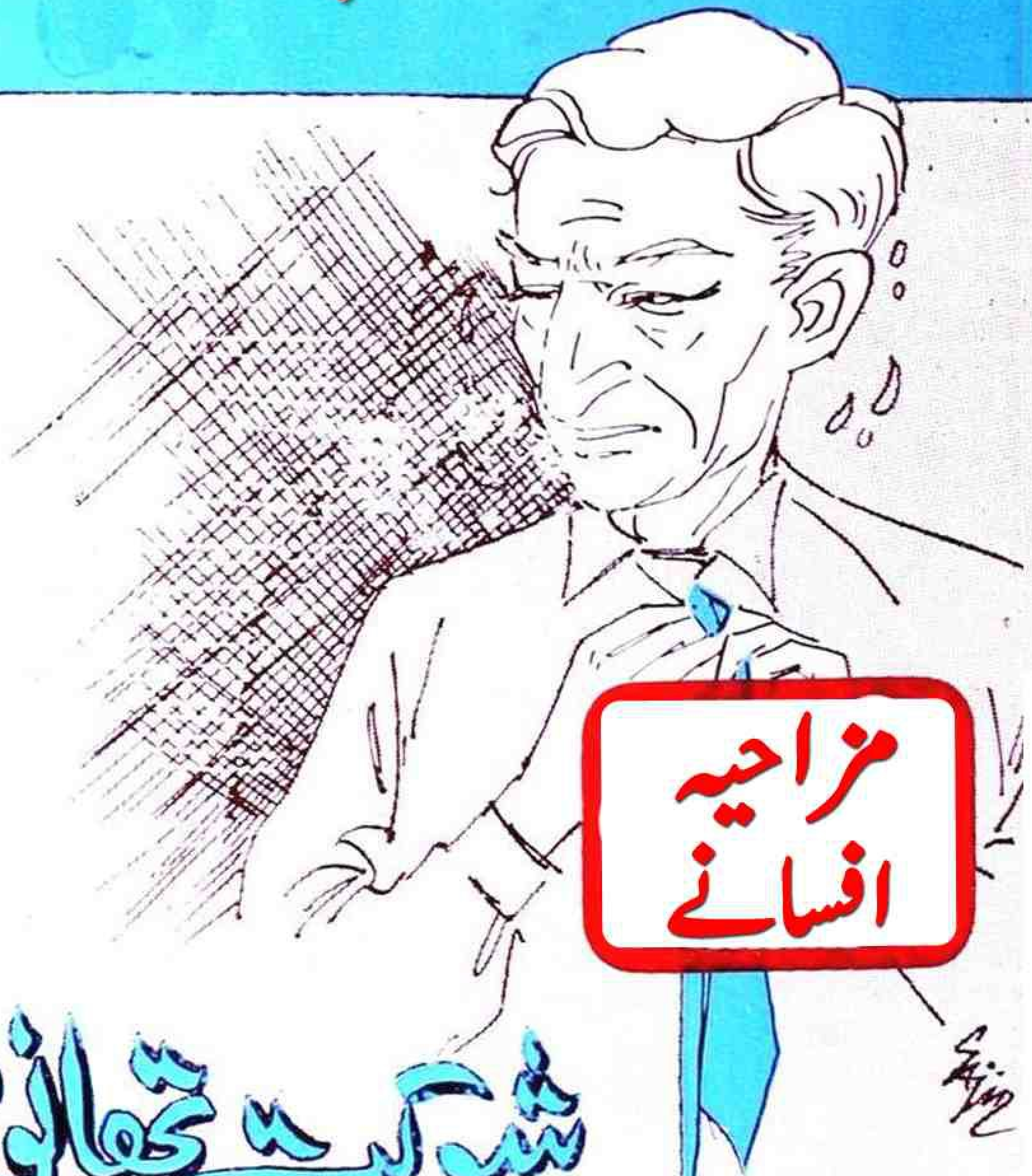

مزاحیہ افسانے

شوکت تھانوی

جی ہاں پٹاخے ہیں

(مزاحیہ افسانے)

شوکت تھانوی

"JI HAN PITE HEIN"
By
Shaukat Thanvi
Year of Publication 1998
Price Rs.80/-

پبلشرز

"ہمانشو پبلیکیشنز"

ایف یو۔ 6 ـــ وشاکھا انکلیو

پیتم پورہ۔ دہلی نمبر 110034

Publishers

Himashu Publications
FU-6, Pitampura,
Delhi-110034
Phone No. 7072921

جی ہاں پڑے ہیں

(مزاحیہ افسانے)

1 شوہر نامدار 5

2 رخصتِ علالت 13

3 سانپ مار خاں 23

4 چھلانگ 33

5 شادی کا اشتہار 43

6 نواب منجھو صاحب 55

7 کانا پردہ 65

8 کیا میں شاعر ہوں 73

9 جی ہاں پڑے ہیں 85

10 آسیب 97

11 ایک ملازم کی ضرورت ہے 109

12 بیری اور ڈھیلے 125

13 دوزخ 135

14 حضور 155

15 آئینہ 167

16 چور دروازہ 175

17 غلطی میری ہی تھی (ایک پر لطف مباحثہ) 217

شوہرِ نامدار

میں نے مرزا کو سو باتوں کی ایک بات یہ بتائی کہ بھائی میں بزدل ہوں۔ لیکن وہ اسے میری سہل انگاری سمجھتے ہیں۔ اور اُن کا خیال یہ ہے کہ میں جان بوجھ کر بیوی کا ذلیل بنا ہوا ہوں۔ بھلا بتائیے کسی کو خواہ مخواہ یہ شوق تو ہو نہیں سکتا کہ وہ تر نلج ہوتے ہوئے بھی پاپوش بردار بن کر رہ جائے۔ کوئی نہ کوئی بات تو ہے کہ میں سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن یہ ناممکن ہے کہ بیوی سے ڈرنا چھوڑ دوں۔ مجبر ڈرنا تو اسے مرزا ہی کہتے ہیں۔ ورنہ ڈراصل یہ ڈر نہیں ہے شرافت ہے۔ اور اگر سچ پوچھئے تو اسی شرافت کی وجہ سے اب تک خاندان کی عزت باقی ہے۔ ورنہ جس طرح مرزا کی اپنی پہلی بیوی سے مقدمے بازی ہوئی تھی وہی نوبت یہاں آجاتی۔ یا جس طرح مرزا کی دوسری بیوی نے خودکشی کی ہے، وہی کلنک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پر بھی لگ جاتا۔ یا جس طرح مرزا کی تیسری بیوی انہیں سارے جہان میں بدنام کرتی پھرتی ہیں وہی صورت اپنے یہاں بھی ہوتی۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ جب مرزا کو خود اُن کی تاریخ کے یہ حوالے دیئے جاتے ہیں تو وہ شرمندہ ہونے

کے بجائے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہتے ہیں۔

"بے شک یہ سب کچھ ہوا۔ مگر کوئی میں تمہاری طرح بزدل تھوڑا ہوں۔ کہ ان باتوں سے ڈر جاتا۔"

جس دن مرزا نے یہ بات کہی ہے۔ میں نے بازی جیت لینے کے انداز سے کہا۔

"بس مرزا بس! آخر تم نے بھی تسلیم کر ہی لیا کہ میں بزدل ہوں۔"

مرزا نے منہ بنا کر کہا — "بزدل ہو تھوڑی تم۔ بنتے ہو۔ ورنہ اگر آج چاہو تو مزاج ٹھکانے کر دو اُن بیگم صاحبہ کے جو تاش تک نہیں کھیلنے دیتیں۔"

میں نے کہا — "مگر نتیجہ کیا ہوگا؟ وہی مقدمہ بازی جس کا تمہیں تجربہ ہے۔"

مرزا نے ڈانٹ کر کہا۔

"نہ سمجھو نہ بوجھو۔ اُس مقدمے بازی کا اِس سے کیا تعلق؟ وہ تو قصہ ہی کچھ اور تھا۔ اُن کے باپ چاہتے تھے مجھے گھر داماد بنا کر رکھنا۔ اور میرا مقولہ یہ تھا، ساس کے گھر جنوائی کتا۔ اسی لئے میں نے رخصتی کا دعویٰ کیا۔ وہ فارغ خطی لکھوانے پر تل گئے۔ نتیجہ یہ کہ یکمشت تینوں طلاق عرض کر دیئے۔"

میں نے کہا —

"اچھا مانا۔ مگر وہ خودکشی والا واقعہ؟"

مرزا نے الجھ کر کہا — "لاحول ولا قوۃ۔ یعنی عجیب کھوپڑی پائی ہے تم نے میاں وہ خودکشی تو دراصل مجھے پھانسی سے بچانے کے لئے کی تھی اس احمق بیوی نے اس لئے کہ اُسے یہ تو معلوم ہی تھا کہ اگر وہ خودکشی نہ کرے گی تو میں اُسے قتل کر دوں گا۔

اس لئے مجھ کو قتل کے جرم سے بچانے کے لئے وہ کچھ کھا کر سو رہی۔ اختلاف یہی تھا کہ وہ مجھے تاش کھیلنے سے منع کرتی تھی۔ اور میں یہی کہتا تھا کہ تم گھر کی بیٹھنے والی بڑھیاں تمہیں کیا معلوم کہ مردوں کے لئے تاش کھیلنا کتنا ضروری ہے۔ ایک دن وہ دے بیٹھیں جان کی قسم۔ اس لئے میں نے بھی صاف صاف کہہ دیا۔ جس جان کی قسم دے رہی ہو اسی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے اگر آئندہ منع کیا۔ اس لئے وہ مجھے اس زحمت سے بچانے کے لئے بقلم خود چل بسی۔ خدا غریقِ رحمت کرے۔"

میں نے کہا ــــ

"مگر جناب کی زوجۂ وقت ہی کون سی آپ سے خوش ہیں؟"

مرزا نے اکڑ کر کہا ــــ "خوش اس لئے نہیں ہیں کہ میں تمہاری طرح ہاتھ باندھے کھڑا نہیں رہتا۔ مجھے انہیں خوش کرنے کی فکر نہیں ہے۔ وہ میرے خلاف ساری دنیا میں ڈھول پیٹتی پھرتی ہیں۔ لیکن تم دیکھ لو، میری وضع میں کوئی بھی فرق آیا؟ وہی رات رات بھر تاش ہوتے ہیں۔ پھڑ جمی رہتی ہے۔ آتا ہے دھن جاتا ہے دھن۔ تمہاری طرح نہیں کہ جوتے بغل میں دبا کر گھر سے نکلنا چاہا تو آواز آئی۔

"کہاں چلے؟"

بس ہکلا گئے۔ بوکھلا گئے۔ اور بہانہ بازیاں شروع کر دیں کہ محفلِ وعظ میں جا رہا تھا۔ احتراماً جوتا یہیں سے اتار لیا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ بیوی نہ ہوئی لیفٹیننٹ گورنر ہو گئی۔ پیر کی جوتی کو سر چڑھایا ہے تو اب کھاؤ جوتیاں۔"

میں نے ذرا سمجھنے کے لئے پوچھا۔

"اچھا تو تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

مرزا نے بہت مستعدی سے کہنا شروع کیا ــــــ

"کرو یہ کہ جاؤ گھر میں۔ بیوی سے کہو کہ سو روپے کا ایک نوٹ نکالو۔ وہ پوچھیں گی، کیا کرو گے؟ تو تم اکڑ کر کہدو، جوا کھیلوں گا"

میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"باپ رے باپ! قیامت تک مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا"

"مرزا نے جل کر کہا" تو پھر جہنم میں جاؤ۔ اور جہنم کی بھی کیا ضرورت ہے۔ ان حالات میں تمہارا گھر خود جہنم سے بدتر ہے۔ میں پوچھتا ہوں تمہارا تاش کھیلنے کو جی نہیں چاہتا؟"

میں نے کہا۔

"مرزا تمہارے سر عزیز کی قسم بے حد جی چاہتا ہے۔ جب رات کو وہ سو جاتی ہیں تو میں تاش کی گڈیاں لیکر بیٹھ جاتا ہوں۔ اور خود ہی سب کی طرف سے چالیں چلتا رہتا ہوں"

مرزا نے دانت پیس کر کہا" یار تمہاری ان باتوں پر اور بھی غصہ آتا ہے میں پوچھتا ہوں تم شوہر ہو یا زر خرید غلام؟"

میں نے کہا۔

"خیر یہ تو واقعہ ہے کہ میں شوہر ہوں!"

مرزا نے بات کاٹ کر کہا۔" مجھے اس میں شک ہے!"

یہ تھا میری غیرت کا سوال۔ اس لئے میں نے بہت جوش سے کہا۔

"شک؟ شک کیا؟ بخدا میں شوہر ہوں"

مرزا نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "کبھی شوہرانہ اختیارات سے کام کبھی لیا ہے یا بس شوہر ہی ہو؟"

میں نے ایک لمحہ توقف کر کے یاد کیا تو پتہ چلا کہ واقعی شوہرانہ اختیارات سے کام تو کبھی نہیں لیا ہے۔ اور اب یہ اندازہ ہوا کہ مرزا بھی بے چارہ کتنا سچا ہے کہ لعنت ہے اس شوہرانہ زندگی پر جو ہم بسر کر رہے ہیں۔ اور بقول مرزا کے اگر یہی عالم ہے تو بیوی ناک چھید کر کوڑی پہنا دے گی۔ کچھ دیر ان حالات پر غور کرنے کے بعد میں نے مرزا سے کہا۔

"اچھا ایک بات ہے مرزا۔ کوئی ذرا معتدل قسم کی جرأت تجویز کرو۔ جس کا تجربہ کر کے میں دیکھوں تو سہی کہ ہوتا کیا ہے"

مرزا نے کہا۔

"پھر وہی معتدل، صاحبزادے! اگر آپ کو کوئی انقلابی حرکت کرنا ہی ہے تو اپنے امکان کی حد۔ تم جرأت یکجا کرلو۔ اور پہلا ہی حملہ ایسا بھرپور کرو کہ وہ بس منہ دیکھ کر رہ جائیں"

میں نے کہا۔ "وہ تو منہ دیکھ کر رہ جائیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ میں بھی) منہ دکھانے کے قابل رہ جاؤں"

مرزا نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں یہ مشورہ نہیں دیتا کہ تم جا کر کوئی مار دو بے چاری کے۔ بس تم تو جا کر صرف یہ کہو کہ سو روپے نکال کر دو، جوا کھیلنا ہے"

میں نے کہا "یار اس قدر صاف نہ کہلواؤ"

مرزا نے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا: "اچھا تو پھر جانے دو — اور مجھے اجازت دو۔"

میں نے مرزا کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا: "دیکھو نا، بات وہی ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ لیکن میں ان سے اس طرح کہنا چاہتا ہوں کہ سو روپے دے دیجئے انکم ٹیکس ادا کرنا ہے۔"

مرزا نے پہلے تو منہ بنایا۔ کچھ کہنا چاہا۔ پھر کچھ سوچ کر کہا: "بات تو یہ کچھ بھی نہ ہوئی۔ خیر آج پہلا دن ہے تم یہی کر دیکھو۔"

میں مرزا کو بٹھا کر یہی بات کہنے کے ارادے سے مناسب الفاظ ذہن میں جمع کرتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ وہ اس وقت ملازم پر کچھ ناراض ہو رہی تھیں۔ اور غالباً کچھ لکڑیاں جلانے کا قصہ تھا۔ اِسی لئے وہ آگ بگولا ہو رہی تھیں۔ اور جو الفاظ میرے کان میں پہنچے وہ یہ تھے —

"آنکھوں پر چربی چھائی ہوئی ہے۔ مال مفت دل بے رحم۔ بھلا غضب خدا کا، ایک من لکڑیاں چار دن میں پھونک کر رکھ دیں۔ میں پوچھتی ہوں کوئی بھٹی سلگائی تھی کوئی ہولی جلائی تھی! آخر ماجرا کیا ہے؟"

اور جب مجھے دیکھا تو صورت سوال دیکھ کر مجھ سے مخاطب ہو گئیں: "فرمائیے کہئے کیا بات ہے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔ پوچھنا یہ تھا کہ پکا کیا ہے؟"

جواب ملا۔ میرا سر پکا ہے۔ یہ نوکر دکھ کر دیئے ہیں مجھے۔ اور نوکروں کا کیا قصور ہے جب گھر کے مالک کا یہ حال ہے تو ظاہر ہے نوکر یہی کریں گے جو کر رہے ہیں۔

میں نے کہا۔

"یہ ہمارے نمک کی خوبی ہے۔"

وہ بولیں —" چار دن میں ایک من؟"

میں نے سر جھکا کر کہا —

"حد کر دی واقعی —"

بیگم صاحبہ نے کہا "قیمہ بھرے کریلے ہیں اور آلو کا بھرتا۔ مگر ذرا ان سے پوچھئے تو سہی آخر اتنی لکڑی کیوں پھونکی جا رہی ہے؟"

میں نے رفع شر کے لئے کہا "میں تحقیقات کروں گا۔"

اور سر جھکائے باہر آگیا۔ مرزا نے دور ہی سے مجھے سونگھنا شروع کیا کہ میں کامیاب آیا ہوں یا ناکام؟ جب میں قریب پہنچا تو وہ حضرت اصل نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔

"صحیح گئے، سلامت آئے۔ کیا کہا بیگم صاحبہ نے؟"

میں نے کہا "بھئی مرزا! اس وقت موقع مناسب نہ تھا۔ وہ یوں ہی جلی بھنی بیٹھی تھیں۔ لکڑیاں بہت جل گئیں۔"

مرزا نے کہا۔" اماں تف ہے تم پر۔ نہ ہوا میرا گھر۔ ابھی دکھاتا تمہیں کہ کس طرح سو روپے کا نوٹ آکر میرے قدموں پر گرتا ہے۔ وجہ کیا؟ کہ میں ٹھہرا اپنے گھر کا مالک اور تم ہو جورو کے غلام۔"

میں نے کہا "مرزا بس! یہی نہ کہنا۔ میں کہنا نہیں چاہتا ہوں۔ ورنہ مجال ہے ان کی جو وہ انکار کریں۔"

مرزا نے کہا "اجی بس رہنے بھی دیجئے۔"

اور اب واقعی مجھے جوش آچکا تھا۔ یہ مرزا مجھے بہت ذلیل کر رہا تھا۔ اسلئے

میں نے کہا: "اچھا ٹھہرو تم۔ اور ذرا میرا دبدبہ بھی دیکھتے جاؤ۔"

اور یہ کہہ کر میں نے ملازم کو آواز دی اور اس سے کہا۔ "جا کر بیگم صاحبہ سے سو روپے فوراً مانگ لاؤ۔" ملازم تعمیل کے لئے چلا گیا۔ لیکن مرزا واقعی سناٹے میں آ گئے کہ یہ ایک دم مجھے کیا ہو گیا؟ اور میں نے جان پر کھیل کر یہ ڈائرکٹ ایکشن کیسے شروع کر دیا؟ مگر ابھی وہ حیران ہی تھے اور میں اکڑا ہی ہوا تھا کہ ملازم نے آ کر کہا۔ "بیگم صاحبہ بلاتی ہیں۔" میں بڑے عزم کے ساتھ کھٹ کھٹ کرتا گھر میں داخل ہو گیا۔ بیگم صاحبہ نے صورت دیکھتے ہی سوال کیا۔

"سو روپے منگائے گئے تھے؟"

میں نے کہا: "ہاں! وہ بات یہ تھی کہ ارادہ یہ کیا ہے کہ سو روپے کی یکمشت لکڑی منگوا کر ڈالے دیتے ہیں۔ برسات کا موسم ہے۔"

بیگم نے کہا۔

"تاکہ یہ اور بھی فراخ دلی سے گھر پھونک تماشہ دیکھیں۔ کوئی ضرورت نہیں یکمشت لکڑی کی۔ چلے وہاں سے بڑے منتظم بن کر!"

میں نے ملازم سے کہا۔

"جا کر مرزا صاحب سے کہہ دو کہ میں اس وقت نہ مل سکوں گا۔"

اور واقعی مل کر بھی کیا کرتا۔ انہیں یقین نہ آتا کہ میں بزدل ہوں۔ مگر میں بزدلی کو شرافت ——— خصوصاً ایک شوہر کی شرافت کے لئے ضروری سمجھتا ہوں۔

رُخصتِ علالت

سوال یہ ہے کہ اگر آدمی اتنا خوش نصیب نہیں ہے کہ بیمار پڑ سکے تو کیا وہ اتنا بدنصیب ہو جاتا ہے کہ رخصتِ علالت بھی نہ لے سکے۔ پھر یہ کہ یہ رخصتِ علالت آخر ہوتی کس دن کے لئے ہے۔ یہی نا کہ دفتر جانے کو جی نہیں چاہتا، اس لئے لکھ بھیجی درخواست کہ بخار ہے یا پیٹ میں درد ہے یا اختلاجِ قلب کی شکایت ہے۔ اور دفتر کی حاضری سے معذور ہیں۔

چنانچہ اپنے اسی حق سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت یہ پیش آ گئی کہ بجٹ بنانے کا زمانہ تھا اور یہ مصیبت سر آنے والی تھی۔ اسی لئے اس مضمون کی درخواست ارسال کر دی کہ پیٹ میں شدید درد ہے۔ دو دن کی رخصتِ علالت مرحمت فرمائی جائے۔ اتنی سی بات تھی جس کا بتنگڑ یہ بنا کہ ابھی درخواست بھیجی ہی تھی۔ اور آمادہ ہی کر رہے تھے کہ آج ذرا جمے گی تاش کی پھڑ، کہ ملازم

گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور اُس نے کہا کہ ڈپٹی صاحب اور دفتر کے کچھ لوگ موٹر پر آئے ہیں آپ کو دیکھنے۔ صاحب یقین جانئے کہ پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ اور گھبرا کر نوکر سے پوچھا۔

"پھر تم نے کیا کہہ دیا؟"

نوکر نے نہایت سادگی سے کہا۔ مجھ سے پوچھا کہ تمہارے صاحب کیا کر رہے ہیں؟ میں نے کہہ دیا کہ ابھی شیو کیا ہے۔ اب کپڑے بدل رہے ہیں۔"

میں نے اور بھی پریشان ہو کر کہا "غضب کر دیا کمبخت تو نے۔ میں نے بیماری کی چھٹی لی ہے۔ درخواست میں لکھا ہے کہ پیٹ میں شدید درد ہے۔"

نوکر نے کہا "بھلا مجھے کیا معلوم تھا۔"

میں نے کہا "اب جلدی کرو۔ میں بستر پر لیٹتا ہوں۔ مجھے چادر اڑھا دو اور بلا لو سب کو۔"

نوکر نے نہ صرف مجھے بستر علالت پر لٹا کر چادر اڑھا دی۔ بلکہ اپنی طرف سے ذہانت کا یہ بھی ثبوت دیا کہ بستر کے قریب والی میز پر گویا۔ دوا کی شیشی کے طور پر سر میں لگانے کا تیل اور ایک پیالی بھی رکھ کر بھاگا باہر۔ اور میں نے تو پیٹ کے درد کا کرب اپنے چہرے پر پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اور آنے والوں کے قدموں کی چاپ سُن کر کراہنے بھی لگا۔ ڈپٹی صاحب نے کمرے میں داخل ہو کے کہا۔

" ارے بھئی یہ کیسا درد پیدا کر لیا تم نے؟"

میں نے ہاتھ سے سلام کر کے زبان سے کہا: "اُف! توبہ ہے خداوندا۔ شدید درد ہے"

ڈپٹی صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "مگر یہ درد شروع کیسے ہو گیا؟ کھایا کیا تھا رات؟"

میں نے کراہتے ہوئے کہا: "نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ دم نکلا جا رہا ہے۔ معمولی کھانا کھایا تھا۔ پالک کا ساگ اور چاول۔ رات کو دو بجے سے یہ درد اُٹھا ہے"

ڈپٹی صاحب نے وہ شیشی اُٹھا کر کہا: "اور دوا کیا استعمال کر رہے ہو، زلفِ بنگال ہیئر آئیل؟!"

وہاں پڑا ایک قہقہہ۔ اور میں نے کراہتے ہوئے کہا: "یہ تو، یہ تو ابھی میں نے سر میں لگایا ہے۔ اس حالت میں شیو کیا۔ کپڑے بدلے۔ ارادہ تھا کہ ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا لیکن ہمت نہ ہوئی۔ پھر لیٹ گیا۔ اس وقت درد کچھ زیادہ ہی ہے۔ کلیجہ منہ کو آ رہا ہے میں بیان نہیں کر سکتا اپنی تکلیف"

ڈپٹی صاحب نے بہت تشویش سے کہا: "اس حالت میں ڈاکٹر کے پاس تم کیسے جا سکتے ہو۔ ڈاکٹر کو یہاں آنا چاہیے۔ ٹھہرو میں انتظام کرتا ہوں۔ مسٹر اسلم! آپ کار لے کر جائیے۔ اور ڈاکٹر چیٹرجی کو لے آئیے"

مسٹر اسلم تو گویا ادھار کھائے بیٹھے تھے کہ حکم ملے اور وہ ڈاکٹر کو لا کر رکھ دیں۔ وہ تو روانہ ہو گئے۔ اُدھر اور اِدھر ڈپٹی صاحب میرے ملازم کی خبر لینے لگے "یعنی تم بھی عجیب جانور ہو۔ تم سے پوچھا کہ صاحب نے کیا

حال ہے۔ تو تم نے یہ نہیں بتایا کہ وہ تڑپ رہے ہیں درد سے۔ رات کا چاول کچے تو نہیں پکائے تھے؟"

نوکر نے بڑی سیاسی بات کہی۔ "سرکار چاولوں کے کچے ہونے سے کیا ہوتا ہے ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔"

ڈپٹی صاحب نے کہا: "اور تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ صاحب کے لئے کوئی ڈاکٹر ہی لے آتے۔"

نوکر نے کہا: "اس حالت میں صاحب کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جاتا۔"

ڈپٹی صاحب اب دفتر کے لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے: "آپ لوگوں کا خیال تو یہ تھا کہ یہ بجٹ سے جان چرا کر بیٹھ رہے ہیں۔ مگر یہ تو واقعی بیمار نکلے۔ ایک ہی دن میں ان کا حال کیا ہو گیا ہے۔ رنگ زرد، چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ آنکھوں میں وحشت ہے۔"

حالانکہ رنگ میں زردی اور چہرے پر ہوائیوں کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر آ رہا تھا دیکھنے کو۔ اور یہ طے تھا کہ وہ دیکھتے ہی کہہ دے گا کہ مریض کو کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں۔ وہ کہئے کہ اتفاق سے درخواست میں درد ہی لکھا تھا اور درد کے متعلق ڈاکٹر سے بحث کرنے کی کافی گنجائش ہو سکتی ہے۔ کہ وہ درد کی وجہ نہ سمجھ سکے اور مریض درد پر اصرار کرتا رہے۔ البتہ اگر خدانخواستہ بخار لکھ دیتا تو کیا ہوتا۔ بہرحال اب تو اس درد پر قائم رہنا ہی تھا اور ڈاکٹر کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہی تھی۔

بس اسی طرح کراہتا رہا، پیچ و تاب کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب

اپنا خوفناک ہینڈ بیگ لئے داخل ہو گئے۔

ڈپٹی صاحب نے انہیں تعظیم دیتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! ذرا ان مسٹر کو دیکھئے۔ رات کے دو بجے سے یہ درد انہیں تڑپا رہا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے بھی وہی سوال شروع کر دیئے "رات کو کیا کھایا تھا، کھانے کے کتنی دیر بعد درد شروع ہوا؟ درد کی نوعیت کیا ہے یہ مسلسل ہے یا دورے کے طور پر اٹھتا ہے؟ متلی تو نہیں ہوئی؟" وغیرہ

یہ سوال ایسے نہیں تھے کہ ان کا معقول جواب نہ دیا جا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس زبانی جمع خرچ کے بعد اب معائنہ شروع کر دیا۔ پیٹ بجا کر دیکھا۔ پیٹ دبا کر دیکھا۔ اور آخر ایک جگہ پیٹ دبا کر پوچھا۔

"یہاں ہوتا ہے درد؟"

میں نے گویا بڑے کرب کے ساتھ کہا "جی ہاں یہیں ہے۔ للہ نہ دبایئے"

ڈاکٹر صاحب نے پھر اسی جگہ ذرا غور سے پیٹ کو کئی زاویوں سے دبا کر اچھی طرح دیکھا۔ اور پھر ایک دم کھڑے ہو کر ڈپٹی صاحب سے کہا۔

"انھیں فوراً اسپتال لے چلئے۔"

ڈپٹی صاحب نے بڑی تشویش سے کہا "خیر تو ہے؟ آپ بالکل صاف صاف کہیئے۔ میں اس کا قائل ہوں کہ مریض کو اپنا مرض ضرور معلوم ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ معالج سے تعاون کر سکے"

ڈاکٹر صاحب نے کہا " یہ اپنڈی سائیٹس کا کیس ہے۔ فاضل آنت کا ٹکڑا کافی سوج گیا ہے۔ اور ڈر ہے کہ کہیں پھٹ نہ جائے "

لیجئے یک نہ شد دو شد۔ اس اناڑی ڈاکٹر نے ایسا خوفناک مرض بھی تجویز کر دیا۔ کاش میں کہہ سکتا کہ غالباً " آپ کے دماغ کی آنت کا فاضل ٹکڑا سوج گیا ہے۔ جو آپ ایک تندرست آدمی کو اپنڈی سائیٹس کا کیس بتائے دیتے ہیں۔ لیکن یہ کہتے کس منہ سے اور نہیں کہتے ہیں تو یہ کمبخت لئے جاتا ہے اسپتال۔ اور وہاں بلاوجہ پیٹ پھاڑ کر رکھ دیگا۔ مگر اب مرض سے انکار کی بھی گنجائش نہ تھی۔ اس لئے کہ مریض لاکھ فرضی سہی۔ لیکن جب ڈاکٹر نے مرض تجویز کر دیا تو وہ اصلی ہی ہوا۔ پیٹ کی آنت خواہ کسی حالت میں ہو۔ مگر یہاں تو الٹی آنتیں گلے پڑ گئی تھیں۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ ادھر ڈاکٹر صاحب ایمبولینس کار منگانے کے لئے ٹیلیفون تک کرا چکے تھے۔ اور اب بیٹھے سمجھا رہے تھے۔ " دیکھئے مسٹر! بالکل گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہماری سرجری نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ آپ لیٹے اخبار پڑھتے رہیں گے۔ اور آپ کو خبر بھی نہ ہوگی کہ کب آپریشن ہو گیا۔ اور کب یہ مصیبت آپ کے پیٹ سے نکل گئی۔ یہ فاضل آنت ہر ایک کے پیٹ میں ہوتی ہے اور اسے کٹوا دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔ ورنہ کبھی نہ کبھی یہ اسی طرح تکلیف دیتی ہے۔ بہرحال آپ اخبار پڑھتے رہیں گے۔ اور آپریشن ہو جائے گا "

مجھے اخبار میں ابھی سے اپنے بے موت مرنے کی خبر نظر آنے لگی تھی۔ کئی بار ارادہ کیا کہ صاف صاف کہہ دوں کہ صاحب واقعہ صرف یہ ہے کہ میں نے

بہانہ کیا تھا۔ ورنہ بخدا نہ پیٹ میں درد ہے۔ نہ میرے پیٹ کی کوئی فاضل آنت سوجی ہے۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ لیکن ذرا غور تو کیجئے کہ یہ اعتراف اب کس قدر مشکل ہو چکا تھا۔ میں ابھی اسی پریشانی اور ادھیڑ بن میں تھا کہ ایمبولینس کار آموجود ہوئی۔

جب مجھے ڈپٹی صاحب نے سہارا دیکر اٹھایا تو میں نے جان پر کھیل کر سب کچھ کہہ دینا چاہا۔ لیکن صرف اتنا کہہ سکا۔

"درد۔۔۔ درد تو اب ہے نہیں ۔"

ڈپٹی صاحب نے کہا۔ "کیا بزدلی کی باتیں کر رہے ہو۔ آپریشن کے ڈر سے کہہ رہے ہو کہ درد نہیں ہے۔ بھلا کوئی بات بھی ہو ۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "اگر واقعی درد نہیں ہے تو بہت اچھی بات ہے۔ ورنہ ہمیں آپریشن کرنے کے لئے درد میں کمی کا انتظار کرنا پڑتا۔ اب اگر درد نہیں ہے۔ تو آپریشن فوراً ہو سکتا ہے۔ انھیں لے چلنے میں جلدی کیجئے۔"

اور یہ سنتے ہی ڈپٹی صاحب اور دوسرے ہمدردوں نے مجھے اٹھا کر ایمبولینس کار میں لٹا دیا۔ ڈپٹی صاحب نے اور سب دفتر والوں کو تو رخصت کر دیا۔ صرف مسٹر اسلم کو ساتھ لئے اپنی گاڑی پر ایمبولینس کار کے ساتھ اسپتال آ گئے۔ اب یہ معلوم ہو چکا تھا کہ درد جب تک کم نہ ہو آپریشن نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے راستے ہی سے پھر کراہنا شروع کر دیا تھا۔ اور اسپتال پہنچ کر بھی ڈاکٹر صاحب کو یہی بتایا کہ درد کم ضرور ہو گیا تھا۔ لیکن اب پھر بہت شدید ہے۔

یہ سُنکر ڈپٹی صاحب نے کہا۔

' ابھی کم دم نہیں ہوا تھا۔ آپریشن سے ڈر کر درد کی کمی کا بہانہ کر رہے تھے۔ '

کاش! انہیں معلوم ہوتا کہ بہانے کی نوعیت کیا ہے۔ بہانہ تو وہ ضرور تھا۔ لیکن درد کی کمی یا زیادتی کا نہیں۔ بلکہ درد ہی کا بہانہ یہ مصیبت بن گیا تھا۔ دم نکلا جا رہا تھا۔ اسپتال کی یہ خوفناک فضائیں دیکھ دیکھ کر۔ دواؤں کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ شیشے کی الماری میں جو چمکتے ہوئے نشتر اور چاقو رکھے تھے۔ وہ گویا خود ہی اُٹھ اُٹھ کر پیوست ہوئے جا رہے تھے۔ لیکن اب مفر کی کوئی صورت نہ تھی۔ اگر صاف صاف یوں کہہ دوں کہ یہ بیماری خود ساختہ ہے اور محض بجٹ کے جھمیلے سے بچنے کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا تو بھی ڈپٹی صاحب کو یقین نہیں آسکتا۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ آپریشن سے بچنے کے لئے اب یہ بہانہ تراشا جا رہا ہے۔ لیکن میں نے ایک آخری کوشش کر دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے ہوئے مسٹر اسلم کو قریب بلا کر کہا۔

' ذرا آپ مجھ سے ایک راز کی بات سُن لیں '

ڈپٹی صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا ' واقعی تم بڑے بودے اور نہایت بُزدل ہو۔ اب گویا وصیتیں کرنا چاہتے ہو۔ اچھا خیر۔ تم یہ حماقت بھی کر لو۔ سُن لو بھئی اسلم یہ کیا کہتے ہیں۔ '

میں نے علی الحساب چند قسمیں کھا کر کہا ' بخدا میں بیمار نہیں ہوں۔ اور تمہاری

ہی قسم کہ میں نے بجٹ کے جھگڑے سے گھبرا کر چھٹی لینا چاہی تھی ۔ جس کی سزا بھگت رہا ہوں ۔ لیکن اب میں اپنی سزا کو پہنچ چکا ہوں ۔ خدا کے لئے مجھے خواہ مخواہ کے آپریشن سے بچائیے ۔"

اسلم نے نہایت مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا ۔ اور خاموشی کے ساتھ اٹھ کر ڈپٹی صاحب سے رازدارانہ طریقے پر یہ تمام باتیں کہہ دیں تو دیکھیے نہایت بیہودگی سے ہنسے ۔

"کمال کرتے ہو مسٹر اسلم تم بھی ، اگر یہ واقعی بہانہ ہوتا تو ڈاکٹر صاحب اپنڈی سائیٹس کیسے تجویز کرتے ۔ یہ صرف آپریشن سے بچنے کی باتیں ہیں ۔"

اور ڈاکٹر صاحب نے قریب آکر کہا ۔ "اب تو کچھ سکون معلوم ہوتا ہے اس لئے میں تیاری کروں ؟"

میں نے گھبرا کر کہا ۔" ڈاکٹر صاحب سکون کیسا ۔ میری تو جان پر بنی ہوئی ہے آپ خود دیکھ لیجئے کہ وہ فاضل اپنڈ اب کس عالم میں ہے ؟"

ڈاکٹر صاحب قریب آکر پھر پیٹ ٹٹولنے لگے ۔ اور خوب اچھی طرح دیکھنے کے بعد کہا ۔

" نہیں صاحب ! اس حالت میں آپریشن خطرناک ہو سکتا ہے ۔ میں ایک دوا دیتا ہوں ۔ اگر درد کی شدت کم ہو گئی تو صبح آپریشن کر دوں گا ۔"

اور میں نے اطمینان کی سانس لی کہ شب درمیاں است ۔ تھوڑی دیر ڈپٹی صاحب بھی ٹھہرے ۔ پھر تسلی تشفی دے کر اور صبح آنے کا وعدہ کر کے مع مسٹر اسلم کے چلے گئے ۔

اسپتال میں جب ہر طرف سناٹا ہو گیا تو میں اپنے بستر علالت سے اٹھا۔ پنجوں کے بل کمرے کے باہر نکلا اور پھر جو سر پر پیر رکھ کر بھاگا ہوں تو گھر آکر دم لیا۔ کچھ ضروری سامان لیا اور نوکر کو ہدایت کر دی کہ میں اسی وقت جس طرف کی گاڑی مل گئی اس شہر کے باہر جا رہا ہوں۔

دوسرے دن راولپنڈی پہنچ کر میں نے ڈپٹی صاحب کو خط لکھا اور آخر میں یہ بھی لکھ دیا کہ اب میری واپسی کی صرف یہی صورت ہے کہ آپ مجھے معاف فرما کر بواپسی ڈاک یہ لکھ بھیجیں کہ مجھ سے واپسی پر اصرار نہ ہوگا کہ میں بلاوجہ آپریشن ضرور کراؤں۔

اب تک مجھے ڈپٹی صاحب کے جواب کا انتظار ہے۔

⁂

سانپ مار خاں

آخر اس اعتراف میں کیا مضائقہ ہے کہ صاحب ہم سانپ سے ڈرتے ہیں اور یہ کون سی بہادری ہے کہ سانپ سے نہ ڈرا جائے، چاہے وہ کسی دن آ کر چپکے سے سونگھ ہی کیوں نہ جائے۔ یہ سچ ہے کہ موت برحق ہے۔ اور جو پیدا ہوا ہے اُسے مرنا ضرور ہے۔ اس ایمان کے باوجود کون چاہتا ہے کہ موت کا خود پیچھا کرتا پھرے بلکہ جانے کیا بات ہے کہ موت سے بھی کچھ زیادہ ہی سانپ سے ڈر لگتا ہے۔ حالانکہ یہ طے ہے کہ سانپ کے کاٹنے کا زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی مر جائے۔ لیکن دل کو کچھ یقین سا ہے کہ سانپ کے کاٹنے سے آدمی صرف مرتا ہی نہیں بلکہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی مر جاتا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو سانپ کے نام سے روح پرواز کرتی ہے لیکن بعض موقعے ایسے بھی آتے ہیں کہ انسان کو بلاوجہ اپنی اس طرح کی فطری کمزوریوں پر مفروضہ پردے ڈالنے پڑتے ہیں۔ اور اسی طرح کا ایک موقع ہمیں بھی پیش آ چکا ہے جس نے اچھی خاصی ملی ملائی بیوی ہاتھ سے کھوائی، اپنی ہنسی

الگ اُڑی اور خون جتنا خشک ہوا ہے اتنا اُس واقعہ کے بعد سے آج تک پیدا نہیں ہو سکا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک نہایت متموّل خاں بہادر صاحب اپنی اکلوتی بیٹی کیلئے ایک نہایت معقول قسم کے سدھے سدھائے جانور کی تلاش میں تھے جو اُن کی بیٹی کا نہایت فرمانبردار شوہر ثابت ہو سکے۔ اور ان دنوں یہ نیازمند ہی اُن کی نظر انتخاب پر تُل رہا تھا۔ حکم یہ تھا کہ صاحبزادے آتے جاتے رہو۔ ہم لوگوں میں اُٹھو بیٹھو تاکہ تم ہمارے متعلق کسی نتیجے پر پہنچ سکو۔ اور ہم تمہارے متعلق کوئی اندازہ کر سکیں۔ چنانچہ ہوتا یہ تھا کہ جب بھی ذرا فرصت ملا بال بال موتی پروئے۔ کریم اور اسنو کے رگڑے دیئے۔ سوٹ پہن کر اور اپنے نزدیک پوری طرح مسلح ہو کر جا پہنچے خان بہادر صاحب کے در دولت پر۔ رفتہ رفتہ ان تعلقات میں بے تکلفی کا رنگ آنے لگا۔ اور اب ناغہ کرنے کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا۔ بات یہ تھی کہ خان بہادر صاحب کی دولت اور حشمت ایک طرف۔ لیکن خود اُن کی صاحبزادی میں بلا کی جاذبیت تھی۔ وہ بجائے خود ایک انجمن تھیں۔ ہر وقت اُن کے آس پاس ایک نہ ایک ہنگامہ ضرور رہتا تھا۔ کبھی اُن کی خالہ زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد قسم کی بہنیں اُنھیں گھیرے ہوئے ہیں۔ اور وہ چہک رہی ہیں۔ لپک رہی ہیں۔ کبھی ان کی سہیلیوں کا جمگھٹا ہے اور زندگی، اور زندہ دلی ہر طرف سے سمٹ کر ان کے گرد جمع ہو گئی ہے۔ رہ گئے خان بہادر صاحب، اُن کی زندگی کا تو واحد مقصد ہی یہ تھا کہ وہ اپنی صاحبزادی کو شگفتہ اور بشاش دیکھیں۔ اسی لئے وہ خود اس تمام چہل پہل میں برابر کے شریک رہتے تھے۔ اور اب تو ہماری موجودگی بھی اتنی

ضروری بن گئی تھی کہ اگر کسی موقع پر اتفاق سے پہنچ نہ سکے تو آدمیوں سے لیکر موٹر تک سبھی دوڑائے جاتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ آپ کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی ۔

بہر حال یہی دور تھا کہ ایک دن جو سہ پہر کی چائے میں شرکت کرنے خان بہادر صاحب کے یہاں پہنچے ہیں تو وہاں عالم ہی کچھ اور تھا ۔ ڈرائینگ روم کا تمام متفرق سامان سب باہر ڈھیر تھا ۔ اور جسے دیکھئے وہ حواس باختہ نظر آرہا تھا کسی کے ہاتھ ہاکی اسٹک ہے اور گھبرایا پھر رہا ہے ۔ تو کسی کے لبوں پر لپ اسٹک ہے اور چہرے کا رنگ اڑا ہوا ۔ نہ وہ قہقہے ہیں نہ وہ چہچہے ۔ ایک عجیب افراتفری کا عالم ہے ۔ معلوم یہ ہوا کہ ڈرائنگ روم میں ایک سانپ نکل آیا ۔ جسے کسی اناڑی نے اس طرح مارا کہ وہ چوٹ کھا کر دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا ۔ اور اب یہ طے ہے کہ وہ زخم خوردہ سانپ بدلہ ضرور لے گا ۔ خان بہادر صاحب کی صاحبزادی جو نسبتاً کم پریشان نظر آرہی تھیں ۔ براہِ راست یہ سوال کر بیٹھیں کہ ” کیا آپ بھی سانپ سے ڈرتے ہیں ؟ “

ظاہر ہے کہ اس سوال کے جواب میں وہ ہاں سننے کیلئے تیار نہ تھیں ۔ ورنہ یہ سوال ہی نہ کرتیں اسلئے ہم نے بہت اطمینان سے کہا ۔

” لاحول ولا قوۃ ۔ ڈرنے کی کیا بات ہے بھلا اس میں ؟ “

یہ سنتے ہی اُن کی آنکھوں میں مسرت کی ایسی چمک پیدا ہوئی کہ ہم اپنے صحیح جواب پر جھوم اُٹھے ۔ وہ کہنے لگیں ۔

” میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جب یہ طے ہے کہ ایک نہ ایک دن مرنا ضرور ہے ۔

اور یہ بھی طے ہے کہ جب تک موت نہیں آتی لاکھ سانپ ڈسیں تو بھی کچھ نہیں ہوتا۔ پھر آخر سانپ سے اتنا ڈرنا کیا معنی؟

ان کی ایک خالہ زاد بہن نے کہا۔

"کمال کی باتیں کرتی ہو تم پروین! کوئی تمہارے ایسا نڈر کیسے بن جائے میری تو روح فنا ہوتی ہے سانپ کے نام سے۔"

خان بہادر صاحب جو "احتیاطاً" فل بوٹ پہنے، ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا لئے پھر رہے تھے۔ قریب آکر بولے۔

"ڈرنے والی چیز سے نہ ڈرنا عقلمندی نہیں ہے۔ میں ایسی بہادری سے زیادہ حماقت کہتا ہوں۔ بہر حال اس وقت اگر وہ سانپ مارا نہیں جاتا تو مجھے رات کو نیند نہیں آسکتی۔"

پروین نے ہنس کر کہا "ڈیڈی آپ تو سچ مچ بہت ہی ڈرتے ہیں۔"

خان بہادر صاحب نے ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "کیا جناب بھی گویا سانپ سے ڈرنے کے قائل نہیں ہیں؟"

ہم نے پروین کی آنکھوں میں پھر وہی چمک دیکھنے کے لئے کہا "اب تک تو ڈرنے کا کبھی اتفاق ہوا نہیں ہے۔ حالانکہ کئی مرتبہ سابقہ پڑ چکا ہے۔"

خان بہادر صاحب نے حیرت سے کہا "سابقہ پڑ چکا ہے؟ یعنی تمہارا مطلب یہ ہے کہ سانپ سے باقاعدہ مڈبھیڑ ہو چکی ہے؟ اچھا پھر؟"

عرض کیا "پھر کیا۔ پکڑا اور مار ڈالا۔"

خان بہادر صاحب نے تقریباً چیخنے کے انداز سے کہا "پکڑا! یعنی پکڑ لیا

سانپ کو؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا واقعی تم نے خود پکڑا ہے سانپ کو؟"

عرض کیا "جی ہاں! آخر اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ دراصل سانپ کو مارنے کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ اس کی دم پکڑ کر ایسا جھٹکا دیا جائے کہ اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ جائے۔ بس پھر وہ رینگ نہیں سکتا اور بہت آسانی سے مارا جا سکتا ہے۔"

خان بہادر صاحب نے جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر کہا "یہ تم آخر کہہ کیا رہے ہو؟ دم بھلا کیسے پکڑی جا سکتی ہے۔ میں تو مردہ سانپ کی دم بھی نہیں پکڑ سکتا۔ تم زندہ کا ذکر کر رہے ہو۔"

اور اب سب کے سب ہمارے گرد جمع ہو چکے تھے۔ اور پروین بڑے فخر سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم محسوس کر رہے تھے کہ اس کو ہم پر ناز ہے۔ اور وہ دل ہی دل میں اترا رہی ہے کہ میرا ہونے والا شوہر وہ ہے جس میں صحیح ہمت مردانہ موجود ہے۔ خان بہادر صاحب نے باہر پڑے ہوئے صوفے میدان میں گھسیٹ کر مجلس آراستہ کر لی اور اب سب حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے۔ تو پروین نے یہ ذکر از سر نو چھیڑا۔

"ہاں تو آپ نے بتایا نہیں کہ دم کیسے پکڑی جا سکتی ہے؟"

ہم نے بہت بے پروائی سے کہا "صاحب اس کا کوئی خاص طریقہ تو ہے نہیں بس ذرا سی ہمت کی ضرورت ہے۔ اور ہمت کے بعد تیزی کی۔ میں نے تو ہمیشہ یہ کیا ہے کہ سانپ نظر آیا اور میں نے لپک کر اس کی دم پکڑ کر کوڑے کی طرح پوری طاقت سے جھٹک دی۔ بس اس کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔"

خان بہادر صاحب نے کہا: "کمال ہے صاحب! اور شاباش ہے تم کو۔ گویا یہ تمہارے نزدیک کوئی بات ہی نہیں ہے۔ زندہ سانپ پر جھپٹ پڑنا بڑا کمال ہے۔"

پروین نے پوچھا: "آپ نے بڑے سے بڑا کتنا بڑا سانپ مارا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "یوں تو گز گز اور ڈیڑھ ڈیڑھ گز کے تو کئی مارے ہوں گے۔ لیکن ایک مرتبہ ایک بڑے ہی ظالم ناگ سے مقابلہ ہو گیا تھا۔"

خان بہادر صاحب نے وحشت سے چیخ کر کہا: "ایں؟ کیا کہا، ناگ الامان والحفیظ!"

ہم نے کہا: "جی ہاں بالکل سیاہ ناگ، ہوگا کوئی دو ڈھائی گز لمبا اور پھن اُس کا بالکل توے کے برابر۔ سڑک کے بیچوں بیچ کنڈلی مارے بیٹھا پھنکار رہا تھا۔"

خان بہادر صاحب کچھ صوفے کے قریب کھسک آئے: "اچھا، اچھا، پھر، پھر کیا ہوا؟"

ہم نے کہا: "صاحب! اُسے دیکھ کر ایک بار ٹھنڈا پسینہ تو مجھے آ گیا۔ لیکن میں نے کہا کہ اب اگر بھاگتا ہوں تو یہ حملہ کر دے گا۔ اور خود حملہ کرنے کو میرے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ بالکل خالی ہاتھ تھا۔"

پروین کی خالہ زاد بہن نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہائے میرے اللہ! پھر کیا ہوا؟"

ہم نے کہا: "پہلے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ اُس کی دم کی طرف لپکنا بیکار

تھا۔ اس لئے کہ وہ تو کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔"

خان بہادر صاحب بولے: "میرا دم نکلنے کیلئے تو صرف یہ منظر ہی کافی تھا۔"

ہم نے ہنسکر کہا: "جی ہاں بہت خوفناک منظر تھا۔ کہ نہ تو کسی کو مدد کیلئے بلا سکتے ہیں نہ بھاگ سکتے ہیں۔ نہ اس پر حملہ کر سکتے ہیں۔ البتہ میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا اور چپکے چپکے اپنا کوٹ اتارتا رہا۔ آخر میں نے کوٹ اتار کر جو اُس کی طرف اچھالا ہے تو وہ کوٹ میں اُلجھ کر اپنی کنڈلی کھول کر جیسے ہی میری طرف بڑھا میں نے لپک کر پکڑ لی اُس کی دُم۔ اور ایک زبردست جھٹکا جو دیتا ہوں تو تڑ سے اس کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بس پھر کیا تھا میں نے پتھر مار مار کر اسکا سر کچل ڈالا۔"

خان بہادر صاحب نے اِس طرح اطمینان کا سانس لیا جیسے وہ یہ سننے کے منتظر تھے کہ اس معرکے میں ہم مارے گئے۔ پروین نے یہ سنکر کہا۔

"واقعی یہ تو حیرت انگیز جرأت کی بات ہے۔"

ہم نے کہا: "صاحب! اُس سانپ کے مرنے کی خبر سُن کر قریب کی بستی کے لوگوں نے آکر مجھے گھیر لیا۔ اور مجھے کندھوں پر اُٹھا کر جلوس کی صورت میں بستی میں لے گئے۔ اس لئے کہ اُس ظالم سانپ نے اس بستی کے نہ جانے کتنے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔"

ہم ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ایک زبردست بھونچال آگیا۔ کوئی صوفے سمیت قلابازی کھا گیا۔ کوئی صوفے کے اوپر ہی کھڑا ہو گیا۔ اور خان بہادر صاحب چیخنے لگے۔

"وہ نکلا! وہ رہا!! جانے نہ پائے!!!"

اور معلوم یہ ہوا کہ وہ کمبخت سانپ چوٹ کھا کر اسی صوفے کی دراڑ میں گھس گیا تھا جس پر ہم بیٹھے اپنے یہ کارنامے بیان کر رہے تھے۔ سانپ کو دیکھتے تھا —

ہم سمجھے کہ آگئے 'صفِ محشر لئے' ہوئے۔

تمام جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ غیر ارادی طور پر اچھل کر پروین کی آڑ میں تو آگئے تھے۔ لیکن وہ پہلے تو یہ سمجھی کہ ہم دُم پکڑنے کیلئے پینترہ بدل رہے ہیں۔ لیکن جب ہم مسلسل اُس کی آڑ میں رہے اور وہ سانپ رینگتا ہوا آگے بڑھا تو وہ چیخی۔

" وہ رہی دُم ! پکڑیئے نا دُم !!! اور دیجئے جھٹکا — !! "

یہاں تک کہ اس کی اور باقی سب کی آوازیں ہماری سماعت سے رفتہ رفتہ دور ہونے لگیں اور پھر ہمیں خبر نہیں کہ کیا ہوا؟ جب ہوش آیا ہے تو خان بہادر صاحب کا ملازم ہمارے تلوے سہلا رہا تھا۔ اور ہمارے ہاتھ پیر برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔

اسی ملازم سے یہ معلوم ہو کر اطمینان ہو گیا کہ سانپ آخر پروین کے ہاتھوں مارا گیا۔ لیکن تشویشناک خبر یہ سنی کہ خود ہم بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ اور سانپ کے مارے جانے کے بعد سے سب کے سب ہمارا ہی ذکر کر کے مسلسل ہنس رہے ہیں۔ اس بدتمیز ملازم نے یہ بھی کہا: "صاحب! آپ سے اچھی تو لڑکیاں رہیں کہ سانپ کا مقابلہ تو کرتی رہیں۔ آپ نے تو کمال ہی کر دیا کہ بے ہوش ہو گئے"

ہم ابھی اپنی بے ہوشی کی کوئی معقول تاویل تصنیف بھی نہ کر پائے تھے کہ خان بہادر صاحب آموجود ہوئے اور بڑے طنز سے فرمایا۔

آ گیا ہوش آپ کو؟ بھئی اِس سانپ نے تو خود تمہاری دم کو ایسا جھٹکا

دیا ہے کہ کمال ہی ہو گیا۔"

پروین کی خالہ زاد بہن اپنے منھ پر دوپٹہ رکھے ہوئے آئیں۔ اور ہمیں دیکھتے ہی ایسا دورہ پڑا ہے اُن پر ہنسی کا کہ گھڑوں پانی پڑ گیا ہم پر۔ خان بہادر صاحب نے بہت متانت سے کہا۔

"میں تو بخدا یہ سمجھا کہ اس سانپ نے خدانخواستہ تمہیں کاٹ لیا ہے۔ لیکن جب ڈاکٹر نے آکر دیکھا اور یہ بتایا کہ دہشت کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے ہیں تو اطمینان ہوا۔"

لیجئے! گویا اتنی دیر میں ڈاکٹر بھی آ چکا تھا۔ ہم ابھی کچھ کہنے والے ہی تھے کہ پروین ادھر سے گزریں۔ وہ آگے بڑھ جانا چاہتی تھیں کہ خان بہادر صاحب نے پکار کر کہا۔

"ارے بھئی پروین! انہیں ہوش آگیا ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی انہیں آکر۔" پروین نے دور ہی سے کہا۔ "اب رہنے بھی دیجئے۔ گرجنے اور برسنے کا فرق دیکھ لیا آج!"

خان بہادر صاحب نے ہنس کر کہا۔ "ارے بھئی آؤ تو سہی ادھر، ذرا دیکھو تو انہیں بخدا معلوم ہوتا ہے ان کا خون ہی کسی نے چوس لیا ہے۔ ہلدی پھری ہوئی ہے چہرے پر۔ انہیں کچھ پلواؤ فوراً۔"

اب ہم آخر کہاں تک چپ رہتے۔ بمشکل تمام کہا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ یک دم مجھے ہوا کیا تھا؟"

پروین کی خالہ زاد بہن نے ہنس کر کہا۔ "ہوتا کیا، ڈر گئے تھے۔" ہم نے کہا۔ "خیر ڈرنے کی تو کوئی بات نہ تھی البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اُسی صدمے

سے جو سانپ نکلا ایک دم تو مجھ پر کچھ اثر ہو گیا دہشت کا۔"

پروین نے قریب آتے آتے پھر ایک دم واپس جاتے ہوئے کہا: زبانی جمع خرچ اور اصل معرکے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

خان بہادر صاحب نے بہت صفائی سے فرمایا۔

جب یہ اپنے قصے سُنا رہے تھے مجھے تو اُسی وقت ان واقعات کی سچائی میں شک تھا۔ حالانکہ اگر یہ کہہ دیتے کہ میں سانپ سے ڈرتا ہوں تو میں زیادہ خوش ہوتا کہ بے چارہ سچ تو بول رہا ہے۔"

خیر اُس دن تو جو ذلت ہوئی وہ تو قسمت میں لکھی ہی تھی۔ لیکن پروین کی نگاہوں سے وہ تحقیر پھر کبھی نہ جا سکی جو اُس واقعہ کے بعد سے پیدا ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ جب اسکی شادی ایک میجر صاحب کے ساتھ ہو گئی تو اُس نے اپنے شوہر سے مجھے ملاتے ہوئے کہا تھا کہ" آپ سے ملئے آپ اپنے وقت کے سب سے بڑے تیس مار خاں ہیں ـــــ بلکہ سانپ مار خاں !!"

⁂

چھلانگ

لاہور پہنچ کر سیدھا مسعود کے گھر پہنچا تو وہ حضرت غائب، معلوم ہوا کہیں گھومنے گئے ہیں۔ خیر وہ گھومنے جائیں یا جہنم میں۔ گھر تو ان کا موجود ہی تھا۔ سامان رکھ کر نہایت اطمینان سے نہایا دھویا۔ کپڑے بدلے اور ان کے ملازم سے کہا۔ چائے لاؤ۔ یہ ملازم بھی کوئی نیا جانور ہی پھنسا تھا شاید۔ ایک تو وہ شروع سے آخر تک ایسی مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں اُس کے مالک کا مہمان نہیں کوئی اٹھائی گیرا ہوں اور اِس گھر سے کچھ نہ کچھ اُٹھا کر بھاگنے ہی والا ہوں۔ دوسرے معلوم یہ ہوتا تھا کہ یہ شخص آج تک کسی مہذب آدمی کے یہاں نہیں رہا ہے۔ اور مسعود کو بھی ابھی ایسے انسان بنانے کا موقع نہیں ملا ہے۔ ملاحظہ ہو تمیز داری کہ گلاس میں بنی بنائی چائے لا کر تپائی پر رکھ دی۔ میں نے حیرت سے پہلے اُس بے ہودہ چلئے کو دیکھا۔ پھر اُس نامعقول چائے لانے والے کو دیکھا۔ لیکن وہ خود ہی مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا میں نے اُس سے بہت کچھ کہنا چاہا۔ لیکن بمشکل صرف یہ کہہ سکا۔

"یہ کیا ہے؟"

اُس نے جلے بھنے انداز میں کہا: "چائے ہے اور کیا ہوتی؟"

میں نے اب ذرا وضاحت سے کہا: "چائے تو ہے مگر گلاس میں؟"

اُس نے تُرکی بہ تُرکی کہا: "اور نہیں تو کیا گھڑے میں لاتا؟"

اب میں نے اپنے متعلق کچھ کہنا مناسب نہ سمجھ کر کہا: "کیا مسعود گلاس میں چائے پینے لگے ہیں؟"

اُس نے بہت ہی کھرّے انداز سے کہا: "وہ نہیں پیتے چائے وائے۔ وہ لسّی پیتے ہیں۔"

اب میں اُس نوکر سے کیا مُنھ لگتا۔ اُس سے کہہ دیا۔ یہ چائے لے جاؤ۔ اور خود مسعود ہی کے بستر پر لیٹ کر اُس کا انتظار کرنے لگا۔ قریب ہی پچھلے مہینے کی کسی تاریخ کا کوئی پھٹیچر سا اخبار پڑا ہوا تھا۔ دیر تک اُسی کو دیکھتا رہا۔ اُس میں چھپا پورا معمّہ حل کر ڈالا۔ اُس کے اشتہارات تک پڑھ ڈالے۔ مگر مسعود کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ آخر میں اُٹھا اور اِس خیال سے کہ شاید اور کوئی پڑھنے کی چیز مل جائے الماری کا جائزہ لینا ہی چاہتا تھا کہ نمائش کا اعزازی ٹکٹ سامنے ہی رکھا نظر آیا۔ بس فوراً یہ پروگرام بنالیا کہ یہاں پڑے پڑے انتظار کرنے کے بجائے جب تک جاکر نمائش ہی دیکھ آئیں اتنی دیر میں مسعود بھی گھر آجائیں گے۔ یہ پاس اُٹھا کر جیب میں رکھا اور اُسی جنگلی ملازم سے نمائش کا پتہ پوچھ کر نمائش جا پہنچے۔ گیٹ پر وہ پاس دکھا کر اندر جانا ہی چاہتے تھے کہ گیٹ کیپر نے پاس پر لکھا ہوا نام پڑھ کر جیسے کچھ چونکتے ہوئے کہا۔

آپ ہی ہیں پروفیسر مسعود؟"

ظاہر ہے کہ اس قسم کے موقع پر صرف جھوٹ ہی بولا جا سکتا ہے۔ ورنہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ پروفیسر مسعود نہیں ہیں تو اُن کے نام کا پاس کیوں لائے۔ اس لئے بہت انکسار سے عرض کیا۔

"اب میں اپنے منہ سے کیا عرض کروں؟"

گیٹ کیپر مجھے جواب دینے کے بجائے چیخنے لگا ——

"چودھری صاحب! یہ آگئے ہیں پروفیسر مسعود!"

اور اس آواز پر ایک نہایت حواس باختہ قسم کے بزرگ نے لپک کر میرا بازو تھاما۔ اور اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"ارے صاحب کمال کر دیا آپ نے بھی۔ آج نمائش کا پہلا دن اور آپ نے آج ہی سارا پروگرام گڑبڑ کر دیا ہوتا۔ اگر ذرا دیر اور ہو جاتی۔ خلقت کا ہجوم ہے اور آپ غائب!"

وہ یہ کہتے جا رہے تھے اور گھسیٹے لئے جاتے تھے۔ اپنی کہتے تھے۔ اور دوسرے کی سننے کو تیار نہ تھے۔ آخر ایک خیمے میں لے جا کر سرکس کے مسخروں والا لباس میری طرف اچھال کر کہا۔

"بس اب چٹکی بجاتے تیار ہو جائیے۔ میں جب تک لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کراتا ہوں کہ آپ پہنچ گئے ہیں۔ حضرت آپ کو لینے نمائش کے منیجر صاحب خود دوڑے گئے ہیں آپ کے گھر۔"

میں نے وہ مسخروں والا لباس غور سے دیکھ کر کہا۔

"مگر مجھے بتائیے تو سہی کہ ماجرا کیا ہے؟"

وہ گھبراہٹ کے ساتھ بولے۔

"اب ماجرا واجرا بعد میں بتایا جائے گا۔ پہلے آپ یہ کپڑے پہنئے۔ جلدی سے کمال کر دیا آپ نے بھی۔ ذرا تو وقت کی پابندی بھی کرنی چاہئے انسان کو۔ اور اب بھی آپ کھڑے منھ دیکھ رہے ہیں۔ خدا کیلئے اب دیر نہ کیجئے۔ لائیے میں اتارتا ہوں آپ کے کپڑے۔"

اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں اُن حضرت نے میری شیروانی اتار کر ایک طرف اچھال دی اور جھپٹے قمیض کی طرف۔ میں نے ذرا بچاؤ کی کوشش کی تو اُن کے تیوروں سے اندازہ ہوا کہ شاید قمیض پھاڑ ڈالیں گے۔ اس لئے انھیں قمیض بھی اتار لینے دی اور پھر عرض کیا۔

"حضرت! آپ صرف ایک بات سُن لیجئے میری۔"

وہ گھبرا کر بولے "کمال کرتے ہیں آپ۔ یعنی آپ کو باتوں کی پڑی ہے۔ اور وہاں تماشائیوں کے ہجوم میں نمائش کے انتظامات پر ہنسی اڑائی جا رہی ہے پہلے ہی دن اگر ہماری ہوا بگڑ گئی تو کسی کو منھ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔"

اب میں نے اُن سے صاف صاف کہا۔ "سُنئے جناب! میں یہ مسخروں کا لباس ہرگز نہ پہنوں گا۔"

وہ آستین چڑھا کر بولے۔

"پہنیں گے تو آپ کے فرشتے۔ ہم آپ سے یہ شرط پہلے ہی طے کر چکے ہیں کہ آپ کو یہ لباس پہننا پڑے گا۔ اور چہرے پر بھی کھریا لیپ کر سیاہ لکیریں کھینچیں گے۔"

میں نے کہا۔

"میں آپ سے ایک بات عرض کر دوں کہ میں دراصل ۔ ۔ ۔"

وہ ایک دم کڑک کر بولے۔ معلوم ہوتا ہے سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلے گا۔ عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو تمہیں ذرا بھی خیال نہیں کہ ہماری کس قدر ہنسی اڑ رہی ہے ہمیں دھوکے باز سمجھا جا رہا ہے۔ کہ ہم اشتہار کچھ دیتے ہیں۔ اور دکھاتے کچھ ہیں۔"

میں نے پھر اصل واقعہ عرض کرنے کی کوشش کی ۔۔۔ "بھئی میری بات تو سنیئے۔" مگر چودھری صاحب نے خیمے کے باہر منھ نکال کر کچھ لوگوں کو آواز دی۔

"کلو! امام دین! بجوری!"

اور فوراً ہی تین چار مشٹنڈے خیمے میں آموجود ہوئے تو چودھری صاحب نے نادری حکم دیا کہ ۔۔۔

"یہ ہمیں ذلیل کرانے پر تلے ہوئے ہیں۔ انھیں زبردستی یہ کپڑے پہنا کر ادھ منھ پر کھریا دریا مل کر لاؤ وہاں۔ جب تک میں اعلان کراتا ہوں۔"

وہ تو یہ کہہ کر چلتے بنے اور یہاں ان قصائیوں نے واقعی زبردستی میرے باقی کپڑے اتار کر مجھے وہ جوکروں والا لباس پہنا ہی دیا۔ اور جس وقت وہ میرے چہرے پر چونا مل کر سیاہ لکیریں کھینچ رہے تھے۔ میں نے پھر بہت خوشامد سے کہا۔

"بھائی مجھ سے چاہے جس قسم کے لو میں پروفیسر مسعود نہیں ہوں۔"

ان میں سے ایک نے میرے سر پر سرخ پھندنے والی لمبی سی ٹوپی پہناتے

ہوئے کہا۔

"یہ چکمہ تو خیر کسی اور کو دینا۔ نہیں تو پروفیسر نے پیشگی روپیہ کیوں لیا تھا؟"

دوسرے نے کہا۔

"کوئی پوچھے ایسی ہی جان عزیز تھی؟ تو کس نے کہا تھا اس سولی پر لٹکنے کو؟"

اور اسی وقت میں نے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان سنا۔

"معزز شائقین! آپ کے انتظار اور اشتیاق کی حالت حد ہو چکی ہے لیکن ہم نہایت خوشی کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ پروفیسر مسعود گولڈ میڈلسٹ پہنچ چکے ہیں، اور مینار کے پاس تشریف لا رہے ہیں۔ آپ زندگی اور موت کا یہ کھیل دیکھنے کے لئے جمع ہو جائیں۔ ایک سو چالیس فٹ اونچے مینار سے پروفیسر مسعود اپنے جسم میں آگ لگا کر حوض میں چھلانگ لگائیں گے۔ آئیے! آئیے!! آئیے!!! پروفیسر مسعود آگئے! آگئے!! آگئے!!!"

میرے سارے جسم میں پہلے تو کپکپی پیدا ہوئی۔ پھر معلوم ہوا کہ رگوں میں خون منجمد ہو گیا ہے۔ اور بمشکل تمام میں صرف یہ کہہ سکا۔

"چھلانگ!"

اور وہ چاروں قصائی ایک دم ہنس دیئے اور مجھے خیمے کے باہر دھکا دے دیا۔ یہ موقع غنیمت تھا۔ اس لئے میں سر پر پیر رکھ کر بھاگا ہی تھا کہ ان میں سے ایک نے لپک کر میری گردن پکڑ لی۔ اور مجھے جھنجھوڑ کر کہا۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟ بے ایمانی کی حد کر دی کہ اب عین وقت پر اپنا

ریٹ بڑھانے کے لئے یہ حرکتیں کر رہے ہو "

اور اسی وقت ان خوفناک چودھری صاحب نے آکر کہا۔

" کان پکڑ لے بابا کل سے یہ کھیل موقوف۔ لیکن آج تو چھلانگ لگانی ہی پڑے گی "

میں نے پھر تقریباً رو دینے کے انداز سے کہا۔

" چودھری صاحب اللہ جانتا ہے میں پروفیسر مسعود نہیں ہوں۔ نہ میں نے کبھی چھلانگ لگائی ہے۔ نہ میں چھلانگ لگا سکتا ہوں۔ میں بے موت مر جاؤں گا میرا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔ بخدا میں پروفیسر مسعود نہیں ہوں "

چودھری صاحب نے بہت ہی تعجب سے کہا " کیا مطلب؟ یعنی اب تم پروفیسر مسعود ہی نہیں ہو؟"

میں نے اسی طرح گڑگڑاتے ہوئے کہا " اللہ جانتا ہے میں نہیں ہوں پروفیسر مسعود! میں تو ان کا ایک مہمان ہوں۔ آج ہی لاہور آیا ہوں۔ میں ان کا یہ پاس اٹھا لایا تھا نمائش دیکھنے کے لئے۔ اور یہاں آکر اس عذاب میں پھنس گیا مجھے اپنے بچوں کا واسطہ بخش دیجئے!"

عین اسی وقت لاؤڈ اسپیکر پر پھر اعلان ہوا۔

" ایک سو چالیس فٹ اونچے مینار سے چھلانگ! پروفیسر مسعود کا زندگی اور موت دونوں سے مذاق !!!

چودھری صاحب نے یہ اعلان سُن کر میری اپیل خارج کردی۔ "اب تو کچھ نہیں ہوسکتا۔ تم پروفیسر مسعود ہو یا نہیں ہو، اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ چھلانگ تو لگانی

ہی پڑے گی ۔۔!"

اور میرے سامنے۔ بجلی کے رنگا رنگ قمقموں سے جگمگاتا ہوا وہ ایک سو چالیس فٹ اونچا مینار تھا جس پر چڑھنا ہی میرے لئے دشوار تھا۔ چڑھ کر پھاندنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ میں نے اُسے دیکھ کر اپنی آنکھیں خوف سے بند کر لیں۔ لیکن چودھری صاحب نے مجھے اُس مینار کی طرف دھکا دیا۔ بلکہ تقریباً گھسیٹتے ہوئے مینار تک لے گئے۔ تماشائیوں نے مجھے دیکھ کر تالیاں بجائیں اور مجھے محسوس ہوا جیسے میرے طائرِ روح کو اڑانے کے لئے یہ تالیاں بجائی جا رہی ہیں۔ چودھری صاحب نے میرے ہاتھ میں ایک پیٹرول کی بوتل اور ایک ڈبیا دیا سلائی کی دے کر کہا۔

"چڑھ جاؤ اِس مینار پر اور یہ پیٹرول اپنے اوپر چھڑک کر دیا سلائی دکھا دینا اور فوراً چھلانگ لگا دینا اِس تالاب میں بس چھٹی ہوئی"

"چھٹی" تو خیر واقعی ہمیشہ کے لئے ہونے والی تھی۔ لیکن میں اب بھی بھاگنے کی کوشش میں تھا۔ تماشائی برابر تالیاں بجا رہے تھے۔ آخر میں نے طے کیا کہ ان تماشائیوں سے صاف صاف کہہ دوں کہ مجھے زبردستی پروفیسر مسعود بنایا جا رہا ہے اور میں یقیناً مر جاؤں گا۔ لیکن اُس نقار خانے میں طوطی کی آواز سنتا ہی کون؟ مجبوراً میں اُس مقتل کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن عین اسی وقت مجمع میں کچھ ہلچل سی پیدا ہوئی۔ اور کسی نے یہ آواز بلند کہا۔

"یہ آگئے ہیں پروفیسر مسعود!"

اور چودھری صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گھسیٹا۔ اور دوڑاتے ہوئے

خیمے میں لا کر جلدی جلدی یہ مسخروں والا لباس میرے جسم سے اُتار کر ایک نووارد کو پہنانا شروع کیا۔ میں نے اُس شخص کو دیکھ کر دل ہی دل میں کہا لیجئے اب کسی اور کی شامت آئی۔ اب کسی اور کو پروفیسر مسعود بنایا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ دراصل یہ بھی پروفیسر مسعود نہ تھا۔ بہرحال کوئی بھی ہو۔ ہماری بلا سے۔ ہم تو موت کے منہ سے نکال ہی لئے گئے۔ اُس نووارد نے جلدی جلدی وہ لباس پہنا۔ اپنے چہرے پر عجیب و غریب نقوش بنائے اور دوڑا اُس مینار کی طرف۔

جب میں اپنے ذاتی کپڑے پہن کر اور منہ صاف کر کے اس ہجوم میں پہنچا ہوں۔ تو یہ نووارد ایک سو چالیس فٹ کی بلندی پر پہنچ کر اپنے جسم پر پٹرول چھڑک رہا تھا۔ اُس نے اپنے کو پٹرول سے تر کرنے کے بعد دیا سلائی دکھا کر آگ لگائی۔ اور اب جو پھاندا ہے۔ اُس مینار سے تو تالاب میں ایک چھپاکا ہوا۔ اور فضا تالیوں کے شور سے گونج گئی۔ نووارد تالاب سے نکل کر دوڑا خیمے کی طرف۔ اب میرے دماغ کا بوجھ بھی ہلکا ہو چکا تھا۔ اور دماغ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگی تھی۔ اس لئے سب سے پہلا سوال ذہن میں یہ آیا کہ یہ پروفیسر مسعود نہ ہوا لیکن مسعود نے یہ کرتب دکھانا کب سے شروع کر دیئے؟ مسعود کی زندگی کے اس رُخ کی تو مجھے خبر ہی نہ تھی۔ میں ابھی اس بات پر غور کر رہا تھا کہ چودھری صاحب نے آ کر پھر مجھے گھیرا۔

"چلئے آپ کو پروفیسر مسعود بلاتے ہیں۔ جن کا پاس آپ چرا لائے ہیں۔"

میں خود اس معمے کو حل کرنے کے لئے بیتاب تھا۔ اس لئے بہت ہی مستعدی سے خیمے میں پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نام نہاد مسعود نے کہا۔

"کیوں جناب! یہ میرا پاس آپ نے کہاں سے اڑایا ؟"

میں نے کہا " یہ آپ کا نہیں، پروفیسر مسعود کا پاس ہے۔ جو میرے دوست ہیں اور جن کے گھر میں آج ہی مہمان آیا ہوں "

اُس شخص نے چونک کر کہا " اچھا تو یہ آپ کا بستر وغیرہ رکھا ہوا ہے میرے گھر میں؟!"

میں نے کہا " آپ کے گھر میں یا مسعود کے گھر میں؟"

اُس شخص نے تالی بجا کر کہا۔ " ارے یار کہیں تم اُس مسعود کے مہمان تو نہیں ہو جو کالج میں پڑھاتا ہے؟"

میں نے کہا " جی ہاں جی ہاں ! وہی مسعود "

اُس شخص نے کہا " تو یہ کہو نا۔ وہ تو میرے مکان کے سامنے والی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ میں بھی کہوں کہ پروفیسر اور کون ہو سکتا ہے؟" اور اسی وقت چودھری صاحب نے چائے کا ایک گلاس ان پروفیسر مسعود کو اور دوسرا مجھے تھما دیا۔ اور میں اُن سے یہ نہ کہہ سکا۔ کہ چائے تو یہ ہے مگر گلاس میں ہے البتہ پروفیسر صاحب کہہ رہے تھے۔ " لسی نہیں مل سکتی ؟"

⁂

شادی کا اشتہار

شادی موت کی طرح برحق تو خیر ہے ہی۔ لیکن فی الحال نہ شادی کا کوئی ارادہ تھا، نہ کوئی پروگرام۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے شامت جب چاہتی ہے بغیر کسی اطلاع کے آہی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک دن اخبار میں یہ اشتہار نظر آگیا۔

ایک ناکتخدا۔ جوان العمر، حسین و جمیل
تعلیم یافتہ سگھڑ رئیس زادی کے
لئے ایک ایسے بر کی ضرورت ہے
جو خواہ برسرِ کار ہو یا نہ ہو۔ اعلیٰ
تعلیم یافتہ ہو یا نہ ہو۔ البتہ خاندانی
شریف زادہ ہو۔ اور سب سے
بڑھ کر یہ کہ نفاست پسند، خوش

ذوق اور مذاقِ سلیم رکھنے والا ہو۔
امیدوار کو ایک آدھ ماہ اپنا صحیح
اندازہ کرانے کے لئے میرے گھر پر
مہمان رہنا پڑیگا۔

یہ اشتہار ایک خاں بہادر صاحب کی طرف سے تھا۔ اور اپنی نوعیت کا نہ صرف دلچسپ اشتہار تھا بلکہ اس اشتہار سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ خاں بہادر صاحب کس قدر روشن خیال اور کیسے ترقی پسند بزرگ ہیں میں تو اس اشتہار کو پڑھ کر جھوم جھوم اٹھا۔ اور بار بار اشتہار کو پڑھا۔ یہاں تک کہ میں نے پہاڑ جانے کا پروگرام ملتوی کر کے یہی طے کر لیا کہ تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے خاں بہادر صاحب کے یہاں جاکر قیام کروں گا۔ اگر میں اُن کے معیار پر پورا اتر سکا تو بیوی خواہ کیسی ہی ہو۔ لیکن ایسا ترقی پسند اور روشن خیال خسر ہی ہاتھ آنا کیا کم ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے اُن کے معیار پر پورا نہ اُترا جب بھی ایک نفاست پسند، خوش ذوق اور مذاقِ سلیم رکھنے والے میزبان کا چند دن مہمان رہ کر آجاؤں گا۔ میں نے فوراً خاں بہادر صاحب کو لکھ دیا کہ میں ایک خاندانی شریف زادہ ہونے کے علاوہ ذاتی طور پر نفاست پسند، خوش ذوق اور مذاقِ سلیم رکھنے والا نوجوان ہوں۔ اور مجھے آپ کے اس اشتہار نے اس حد تک متاثر کیا ہے کہ میں آپ کو اپنا اندازہ کرانے کے لئے آپ کے گھر مہمان رہنے کے لئے بے قرار ہوں۔ میرے اس خط کا جواب میری توقع

سے بھی زیادہ جلد آگیا۔ جس میں مجھے خاں بہادر صاحب نے فی الفور طلب فرمایا تھا۔ چنانچہ میں نفاست پسندی، خوش ذوق اور سلیم المذاقی سے لدا پھندا خاں بہادر صاحب کے در دولت پر حاضر ہو گیا۔ وہاں میرا پہلے ہی سے انتظار تھا۔ اور میں اپنی آمد کی اطلاع دے چکا تھا۔ اس لئے میرے لئے اسٹیشن پر کار بھی موجود تھی۔ اس کار سے میں خاں بہادر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا تو مجھے ایک نہایت آراستہ کمرے میں ٹھہرا دیا گیا۔ اور جو صاحب مجھے اسٹیشن لینے گئے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ نہایت اطمینان سے غسل وغیرہ کر کے تیار ہو جائیں تو دوپہر کے کھانے پر خاں بہادر صاحب سے ملاقات ہو گی۔ کاش ان حضرت کو معلوم ہوتا کہ اپنی نفاست پسندی کا سکہ بٹھانے کے لئے تمام راستے غسل ہی کرتا ہوا آیا ہوں۔ بہرحال میں نے ایک بار پھر غسل کیا۔ اور لباس پہننے میں پورے سلیقے کا ثبوت دیا۔ میں دراصل ریل سے سوٹ پہنے اترا تھا۔ لیکن جو صاحب مجھے لینے گئے تھے وہ چوڑی دار پاجامے اور شیروانی میں تھے۔ اس لئے میں نے بھی چوڑی دار پاجامہ پہن کر اس کی چوڑیاں اس خوش سلیقگی کے ساتھ مرتب کی کر خود اپنے جی خوش ہو گیا۔ پھر شیروانی بھی وہ پہنی جس کی بے عیب سلائی کی اکثر احباب داد دے چکے تھے۔ مختصر یہ کہ جب مجھے خاں بہادر صاحب کی خدمت میں باریابی کے لئے طلب کیا گیا ہے۔ میں لباس کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہو چکا تھا۔ اس لئے ایک خود اعتمادی کے ساتھ میں اس کمرے میں پہنچا جہاں ایک باوقار بزرگ محترم کے

علاوہ کئی نہایت شستہ قسم کے نوجوان موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی خان بہادر صاحب نے بہت ہی گرمجوشی اور شفقت کے ساتھ فرمایا۔

"تشریف لائیے اسلم صاحب! تشریف رکھئے! کہئے کیسا سفر گزرا؟"

عرض کیا۔

"بہت آرام دہ سفر ہے یہ تو۔ اور شکر ہے کہ شریکِ سفر بھی کوئی ناجنس نہ تھا۔"

خاں بہادر صاحب نے سگار کا نہایت دبیز دھواں چھوڑتے ہوئے فرمایا۔ "جی ہاں۔ یہ بڑی نعمت ہے۔ اگر کوئی ناجنس شریکِ سفر نہ ہو۔ ورنہ آرام دہ سے آرام دہ سفر عذاب بن کر رہ جاتا ہے۔ آپ کے کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے نا؟"

عرض کیا "جی ہاں! سب کچھ موجود ہے۔"

خاں بہادر صاحب نے جملہ پورا کیا۔ اور جو موجود نہ ہو وہ آپ بغیر کسی تکلف کے طلب کریں۔ معاف کیجئے گا۔ میں نے ان حضرات سے آپ کا تعارف اور آپ کا تعارف ان حضرات سے نہیں کرایا۔ ان تمام حضرات کے نام تھوڑی دیر میں آپ کو خود معلوم ہو جائیں گے۔ اجمالی تعارف یہ ہے کہ یہ سب حضرات میرا دیا اشتہار دیکھ کر تشریف لائے ہوئے ہیں جسے دیکھ کر آپ نے یہ زحمت فرمائی ہے۔ ان حضرات میں سے یہ عزیز محترم انجم صاحب آج ہی واپس تشریف لے جا رہے ہیں۔ اس لئے کہ

آپ ہرے رنگ کے سوٹ پر سُرخ ٹائی باندھنے کے عادی ہیں ۔ اور میں اس قدِ آدم ہری مرچ کی بمشکل تاب لا سکتا ہوں ۔ دوسرے صاحب یہ ہیں ۔ احسن ہے اسم مبارک ان کا ۔ یہ دونوں پیر اٹھا کر کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں ۔ اور انہیں ابھی کرسی پر بیٹھنے کے آداب سیکھنے کی اشد ضرورت ہے اس لئے یہ بھی کل جا رہے ہیں ۔ تیسرے صاحب یہ ہیں شکیل میاں ۔ ماشاء اللہ بہت ذہین اور طبّاع نوجوان ہیں ۔ اور بہت ہی دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں ۔ میں ان سے مل کر جتنا خوش ہوا تھا ، اتنا ہی مجھے یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ اس عمر میں بھی چائے چمچے سے پیتے ہیں اور چائے کا گھونٹ لیتے وقت ایک آواز سی پیدا کرتے ہیں "شڑپ" میں نے انہیں مشورہ دیا ہے کہ چائے پینے کی تربیت حاصل کرنے کے بعد شادی کا ارادہ کریں ۔ باقی حضرات کا ابھی قیام رہے گا ۔ اور آپ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں گی ۔ بہر حال میز تیّار ہے ۔ کھانے پر چلئے وہیں باتیں ہوں گی ۔"

خاں بہادر صاحب کی قیادت میں ہم سب کھانے کے کمرے میں آ گئے جو پُر تکلف کھانوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا ۔ اور کھانے کی میز پر انواع و اقسام کے کھانے چُنے ہوئے تھے ۔ مجھے خاں بہادر صاحب نے اپنے قریب ہی جگہ دی ۔ باقی امیدوار اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور کھانا شروع ہوا ۔ میں نے اندازہ کیا کہ ان تین حضرات کے علاوہ جو اس مقابلے کے امتحان میں ناکام رہ کر واپس جا رہے تھے ۔ باقی سب ہی کی جان پر بنی

ہوئی تھی۔ کوئی صاحب پلیٹ میں بقدرِ اشکِ بلبل کھانا نکال رہے تھے۔ تو کوئی صاحب کانٹے اور چھری پکڑنے میں پوری نزاکت صرف کئے دیتے تھے کسی کو یہ فکر کہ نوالہ چبانے میں منھ سے کوئی آواز نہ نکل جائے۔ اور کوئی اس قدر محتاط کہ نوالہ چبانے میں منھ زیادہ نہ کھلے میں نے یہ ترکیب نکالی کہ خان بہادر صاحب کا اندازہ دیکھتا رہا۔ اور جو کچھ وہ کرتے رہے وہی میں بھی کرتا رہا۔ وہ کانٹے سے پلاؤ سمیٹ کر ہاتھ سے نوالہ بناتے تھے۔ اس لئے میں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ وہ نوالہ کھانے کے بعد چمچے سے دہی پیتے تھے۔ میں نے بھی یہی بیہودہ حرکت شروع کر دی۔ آخر ایک بار جب میں نے کانٹے سے پلاؤ سمیٹ کر ہاتھ سے نوالہ بنا رہا تھا تو خاں بہادر صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

"اچھا یعنی آپ بھی پلاؤ چمچے سے نہیں بلکہ ہاتھ سے کھانے کے قائل ہیں؟"

میں نے کہا "جی ہاں میرے نزدیک پلاؤ ہے ہی ہاتھ سے کھانے کی چیز۔"

خان بہادر صاحب نے اور بھی خوش ہو کر کہا "بالکل ٹھیک۔ پلاؤ کا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ ان انگریزی تکلفات میں۔ مگر یہ حضرات تو چاہتے ہیں کہ شوربہ بھی کانٹے سے تناول کریں۔ ناک میں دم ہے میرا۔ اسی چیزوں کو کانٹے کے تکلف سے۔ ارے بھئی مچھلی ہے۔ کھالو آگے کانٹے

میں پھانس کر کباب ہیں۔ شوق سے کھاؤ کانٹے سے لیکن پلاؤ زردے کا کیا تعلق کانٹے اللہ بچے سے ۔

اب جو دیکھتے ہیں تو سب ہی ہاتھ سے پلاؤ کھا رہے ہیں۔ لیکن مجھ سے دہی پینے کی ابھی کسی کو نہ سوجھی تھی کہ خان بہادر صاحب نے یکدم گویا چیخ کر کہا

"بھئی لاحول ولا قوۃ - یہ کیا کر رہے ہیں آپ انجم صاحب۔ یعنی گلاس میں دہی انڈیل لیا اور اس میں اب پانی ملا رہے ہیں آپ؟"

انجم صاحب نے نہایت بے تکلفی سے کہا۔ جی ہاں۔ میں اس کی لسی بنا کر پیوں گا۔"

خان بہادر صاحب نے نہایت بیزاری سے کہا۔ لسی آپ علیحدہ طلب کر سکتے تھے۔ اس بد مذاقی کی آخر کیا ضرورت تھی۔ افسوس تو یہ ہے کہ آپ نے میرے اشتہار کا مفہوم بھی نہیں سمجھا۔ اور تشریف لے آئے۔ بہرحال آپ میرے عزیز مہمان ہیں۔ اس لئے میں بھی آپ کی خاطر سے یہ ترکیب کر کے دیکھتا ہوں۔"

یہ کہہ کر ان حضرت نے بھی گلاس میں دہی کی لسی بنا کر پینا جو شروع کی۔ تو میرے سوا باقی سب نے یہی حرکت شروع کر دی۔ مجھے اسی طرح پیچھے سے دہی پیتا دیکھ کر خان بہادر صاحب نے کہا۔

"بھئی اسلم صاحب ذرا آپ بھی تجربہ کر کے دیکھئے۔ میرے خیال میں کچھ زیادہ نامناسب نہیں ہے۔ نہایت خوشگوار مزہ ہو گیا ہے

رہی کا۔"

میں نے جان پر کھیل کر کہا۔

"نفاست کے خلاف ہے۔ طبیعت گوارہ نہیں کرتی۔"

خان بہادر صاحب نے گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ، نفاست کے خلاف ہے یہ حرکت۔"

اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کے گلاس میز پر آ گئے، ان تین حضرات کے سوا جو واپس جا رہے تھے۔

کھانے کے بعد خان بہادر صاحب آرام فرمانے گھر میں چلے گئے، اور اب یہ خاکسار اور دوسرے ساتھی دھوپ کھانے سبزہ زار پر آ گئے، تو انجم صاحب نے دل کے بخار نکالنا شروع کئے۔

"بھئی خدا محفوظ رکھے اِس شخص کی دامادی سے۔ اچھا خاصا سنکی ہے بڈھا۔"

شکیل میاں نے کہا۔

"سنکی نہیں ہے۔ بنتا ہے۔ دولت کے نشے میں حواس کھو بیٹھا ہے۔"

احسن نے کہا۔

"بہرحال ہم نے تو بھر پایا۔ اب یہ باقی حضرات جانیں اور ان کا کام مگر خدا ہی ہے جو انھیں کوئی پسند کرے۔ پسند تو کوئی جب آئے کہ خود بدولت کی پسند کا کوئی معیار ہو۔ کل میں نے غالب کا شعر پڑھ دیا تو

ناراض ہوگئے کہ میر کا شعر کیوں نہیں پڑھا۔

انجم نے کہا۔ میاں میں نے تو میر تک کا شعر پڑھ کر دیکھ لیا۔ کہنے لگے کہ بے محل ہے یہ شعر!"

مختصر یہ کہ ان تینوں نے دیر تک خان بہادر صاحب کے خبط پر تبادلۂ خیالات کیا۔ مگر میں اس وقت کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ کہ میں تو آیا تھا یوں ہی تفریحاً یہاں آکر خواہ مخواہ کے امتحان میں مبتلا ہو گیا۔ اور امتحان بھی ایسا جس میں باقاعدہ مقابلے کی کیفیت ہے۔ لیکن اس مقابلے میں بھی ایک دلچسپ کیفیت تھی۔ اس لئے مجھ پر بیزاری کی کوئی کیفیت طاری نہ ہو سکی۔ سہ پہر کو پھر چائے پر خان بہادر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اسوقت وہ موازنہ فرما رہے تھے کتّے اور بلی کا۔ اور مسئلہ یہ زیر بحث تھا کہ کتا پالنا مناسب ہے یا بلّی پالنا؟ عام رائے یہ تھی کہ کتّا بہرحال رفاقت کا حق ادا کرتا ہے۔ اور اپنے مالک سے وابستگی میں اس کا جواب نہیں۔ لیکن میں نے بلی کے حق میں ووٹ دیا۔ خان بہادر صاحب نے حیرت سے کہا۔

بلّی ــــ؟ یعنی آپ کے نزدیک بلّی کو کتّے پر فوقیت حاصل ہے؟"

عرض کیا۔ کچھ بھی سہی مگر بلی کی اِس ادا پر سو جان سے فدا ہوں کہ وہ بہت ہی نفاست پسند ہوتی ہے۔ ہر وقت اپنی صفائی کا خیال رکھتی ہے۔

اچھل پڑے خان بہادر صاحب "بھئی کیا بات کہی ہے! سو باتوں کی ایک بات!! قائل ہو گیا میں بھی۔ بکی کا نہیں، آپ کا، کہ آپ واقعی نفاست پسند ہیں!"

اس کے بعد ذکر چھڑ گیا پھولوں کا۔ اور پھولوں کے حسن کا۔ خان بہادر صاحب نے مجھے مخاطب کیا۔

"معلوم ہوتا ہے اسلم صاحب! کہ آپ نے مالی کو منع کیا کہ آپ کے کمرے میں گلدان نہ سجائے؟"

عرض کیا: "جی ہاں۔ گلدان میں پھول دیکھ کر کچھ اداس سا ہو جاتا ہوں۔ مجھے اس گلدان پر کچھ قفس کا گمان ہونے لگتا ہے۔ جس میں بہت سے پھول اسیر ہوں۔"

خان بہادر صاحب نے آنکھیں گول کر کے کہا: "کتنی گہری بات کہی ہے میں اس بات پر تفصیل سے غور کروں گا۔ مگر گلدان میں کیا واقعی پھول خوبصورت نہیں معلوم ہوتے؟"

میں نے کہا۔

"یہ تو اپنا ذوق ہے۔ میں پھول کے حسن کا اسی وقت تک قائل ہوں، جب تک اس سے خود اپنے کو حسین بنانے کا کام نہ لیا جائے۔ مجھے کوٹ کے کاج میں لگا ہوا پھول کبھی حسین نظر نہیں آیا۔ عورتیں پھولوں کا زیور پہن کر خود بے شک حسین ہو جاتی ہیں۔ مگر پھول بدصورت ہو جاتے ہیں۔"

خان بہادر صاحب نے اس طرح داد دی جیسے مشاعروں میں داد دی جاتی ہے ۔

’’ ائے سبحان اللہ ! بھئی تم تو واقعی شاعر بھی معلوم ہوتے ہو ۔ کتنی لطیف بات کہی ہے ۔ لطف آگیا ۔ واقعی پھول جب دوسروں کی آرائش پر اپنا حسن قربان کر دے تو وہ خود حسین نہیں رہتا ۔ میں آج ہی مالی کو منع کرتا ہوں کہ گلدستوں کے لئے پھول ہرگز نہ توڑے ۔‘‘

پھر ملازم کو آواز دی جو سامنے ہی کھڑا تھا ۔

’’ ارے کوئی ہے ؟ ہاں ہو تو سہی تم ۔ دیکھو اسلم صاحب کا سامان میرے برابر والے کمرے میں پہنچا دو ۔

اس کے بعد باقی حضرات کی طرف متوجہ ہوئے ۔ ’’ آپ سب حضرات جب چاہیں جا سکتے ہیں ۔ مجھے جس کی تلاش تھی وہ مل گیا ۔ مجھے ایسے ہی ہمجنس رفیق کی ضرورت تھی ۔ کاش میری واقعی کوئی لڑکی ہوتی جس سے میں ان کی شادی کر سکتا ۔‘‘

میں نے سناٹے میں آکر کہا ـــــ

’’جی کیا فرمایا ـــ ؟‘‘

خاں بہادر صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا ’’ یہ ایک عجیب دلچسپ تفریح سوجھی تھی مجھے ۔ اس ویرانے میں تنہا رہتے رہتے گھبرا کر میں نے کہا ۔ چلو یہی پھلجھڑی چھوڑ دوں ذرا لطف رہے گا ۔ بھانت بھانت

کے لوگوں سے ملاقات ہو گی۔ مجھے کیا، معلوم تھا کہ مذاق ہی مذاق میں تمہارے ایسا دوست مجھے حاصل ہو جائے گا۔"

اُس وقت تو میں بھی ہنستا رہا۔ لیکن شام تک میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ کہ ایک آدھ نہیں، کئی پرزے ان حضرت کے غائب تھے۔ اور اندیشہ تھا کہ یہ نہ جانے کب حملہ کر بیٹھیں۔ اِس لئے رات کی ٹرین مجھے گھر کی طرف لا رہی تھی۔ تا کہ صبح خاں بہادر صاحب خود کریں کہ وہ پھول جو خوب صورت بننا چاہتا ہے۔ دوسرے دن کو کبھی آرائش نہیں دیتا۔

⁂

نواب منجھو صاحب

اعلیحضرت فلک منزلت ثریّا جاہ عالم پناہ نواب منجھو صاحب اپنا ململ کا کڑھا ہوا کرتا خود اپنے دست مبارک سے دھو کر سوکھنے کے لئے الگنی پر ڈال چکے تھے۔ اور اب دوبلی ڈلی پر صابن مل رہے تھے۔ کہ دروازے پر پڑا ہوا ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر چھوٹی شہزادی صاحبہ اپنے جوڑے دونوں ہاتھوں سے کھجاتی ہوئی برآمد ہوئیں اور فرمایا۔

"ابا حضور! امی سرکار فرماتی ہیں کہ راشن والا کہتا ہے، پچھلے دام ادا کر دو گے تو راشن ملے گا۔ ورنہ نہیں۔"

نواب صاحب کی پیشانی پر جہاں ستارۂ اقبال چمکا کرتا تھا۔ ایک شکن پیدا ہوگئی۔ اور آپ کے چہرے پر تمام شاہی جلال

یکلخت پھٹ پڑا۔

"دیکھ لیجیے جناب والا! اسے کہتے ہیں موری کی اینٹ کا چوبارے چڑھنا۔ یہ ہماری پرجا ہے جو اب یوں منھ آنے لگی ہے۔ اس قسم کی باتوں پر آپ کے سر عزیز کی قسم جی چاہتا ہے کہ ان گستاخوں کو زن بچہ سمیت کولھو میں پلوا دیا جائے۔ ہائے نہ ہوئی اپنی حکومت!"

عرض کیا۔ "مگر عالیجاہ! وہ بے چارہ بھی کیا کرے معلوم نہیں کب سے اس کا حساب نہیں ہوا"

نواب صاحب نے تنک کر فرمایا۔

"کون سے سال دو سال ہو گئے؟ مشکل سے دو ڈھائی مہینے کا حساب ہوگا۔ مگر ذرا غور تو کیجیے، آپ کے سر عزیز کی قسم یہ وہ لوگ ہیں جو اس کی تمنا کیا کرتے تھے کہ کبھی ہماری نظر ان کی طرف اٹھ جائے۔ جس عمارت میں یہ ٹٹ پونجیہ راشن کی دکان کھولے بیٹھا ہے۔ دادا جان جنت مکانی کی مردانہ بیٹھک تھی۔ جس میں دن عید اور رات شب برات کا عالم تھا۔ آج بٹیروں کی پالی کا ہنگامہ ہے تو کل نتوا بچوا کا مجرا ہو رہا ہے۔ آج مشاعرے کی محفل گرم ہے تو کل انتخاب زمانہ شطرنج کے کھلاڑی جمع ہیں۔ اور دادا جان چومکھی لڑ رہے ہیں۔ روپیہ ہاتھ کا میل، دولت بہتا پانی۔ یہ جتنے آپ کو آج بڑے ساہوکار نظر آ رہے ہیں۔ سب ہمارے ہی دسترخوان پر

بجنکا کرتے تھے۔ مگر خدا کی شان کہ اب یہ ہماری بلّیاں ہم ہی سے میاؤں کہتی ہیں۔"

دست بستہ عرض کیا۔

جان کی اماں پاؤں تو عرض کروں کہ عالم پناہ! وہ زمانہ تو گیا۔ بلکہ اسے خود آپ کے اولوالعزم بزرگوں نے ڈنڈے مار مار کر بھگا دیا۔ اب محض اس وضعداری اور اپنی ان روایات کے سہارے تو ذرا مشکل ہی سے زندگی بسر ہو سکے گی۔"

نواب صاحب نے پہلو بدل کر شاہزادی صاحبہ سے فرمایا۔" جاؤ کہہ دو کہ ہو جائے گا کچھ انتظام۔ مگر ذرا یہ پوچھنا کہ آج نہ پیچوان آیا اب تک نہ خاصدان، یہ ماجرا کیا ہے؟"

شاہزادی صاحبہ کے جانے کے بعد نواب صاحب نے اپنی دوپلی ٹوپی نچوڑ کر مونڈھے پر پھیلا دی۔ اور خودغرقی سنبھالتے ہوئے کچھ کبیدہ خاطر سے مسند نشین ہوتے ہوئے بولے۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ ہونے والا کیا ہے۔ وہ زمانہ آ لگا ہے کہ عقل کام نہیں کرتی۔ محل بکے، حویلیاں نیلام پر چڑھیں۔ تمام گرہستی ختم ہوئی۔ بیگمات کے زیوروں کے تار تار تک نوبت آئی۔ مگر آخر کب تک؟"

دست بستہ عرض کیا۔" حضورِ والا! اسی دن کے لئے یہ غلام ہمیشہ عرض کرتا رہا کہ عالم پناہ اب ایوانِ خسروی سے نکلیں اور کچھ ہاتھ پیر ہلائیں۔ بیٹھے بیٹھے جہاں تک کھا سکتے تھے کھا چکے۔ یہاں تک کہ

اِس بیکاری نے دور یار خود حضور ہی کے دشمنوں کو کھانا شروع کر دیا۔"

نواب صاحب نے جل کر کہا۔

"یار مولانا! تم اور بھی جلے پر تیل چھڑکتے ہو۔ آخر میں کیا کام کرنا شروع کر دوں؟ تمہارے ہی کہنے سے یہ بھی ارادہ کر لیا تھا کہ حکومت کرنے کے بجائے غلامی شروع کر دیں گے۔ خود تمہارے ساتھ ہی دو تین دفتروں کی بھی خاک چھانی۔ لیکن ہر جگہ وہی صبح دس کی حاضری اور چار بجے کی چھٹی۔ آدمی نہ ہوا کولہو کا بیل ہو گیا۔ صبح دس بجے دفتر پہنچنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اندھیرے منہ زیادہ سے زیادہ نو بجے ضرور بستر چھوڑ دے۔ فرض کر لیجئے کہ میں نے کچی نیند اٹھنے کی عادت ڈال لی تو بھی ایک بجے میرے یہاں دسترخوان چنا جاتا ہے۔ اور اس وقت میں ہونگا گویا دفتر میں۔"

عرض کیا۔ "نواب صاحب! گستاخی معاف یہ دسترخوان تو آپ کو دفتر ہی میں بچھانا پڑے گا۔ تمام دفتری لوگوں کا دوپہر کا کھانا دفتروں ہی میں جاتا ہے اور آدھ گھنٹے کی کھانے کی جو چھٹی ہوتی ہے۔ اسی میں سب کھا پی لیتے ہیں۔"

نواب صاحب نے ادب والی انگلی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر فرمایا: "اماں غضب ہی تو کرتے ہو۔ اسی آدھ گھنٹے میں کھانا، اسی میں حقہ اور اسی میں گویا قیلولہ۔ پھر یہ کہ میں دوپہر کو بھی دو گھڑی سونے کا عادی ہوں۔"

عرض کیا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ملازمت کرنے کو تو تیار ہیں۔ لیکن ملازمت ایسی چاہتے ہیں کہ جب حضور دوپہر کے کھانے کے لئے دسترخوان پر تشریف لائیں۔ تو حسکام بالا چنّور برداری کردیں۔ اور جب عالیجاہ آرام فرمانے کے لئے لیٹیں تو وہ مکّی اور چپّی شروع کردیں۔"

نواب صاحب نے الجھ کر کہا۔" بھئی یہ میں کب کہہ رہا ہوں۔ میرا مدّعا تو یہ ہے کہ میری عادات کچھ اسی قسم کی ہیں۔"

اُسی وقت ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر علیاحضرت شاہزادی صاحبہ پھر جوتے کھسوٹتی ہوئی نمودار ہوئیں۔ ابّا حضور! امی سرکار فرماتی ہیں کہ نہ پان ہے کل سے نہ کتھّا!"

نواب صاحب نے بیزاری سے فرمایا۔" اچھا بھائی نہ سہی۔ دفع ہو یہاں سے!"

اور پھر ایک دم جیسے کچھ یاد آجائے جلدی سے اپنے دونوں کان ٹٹول کر ایک ادھ جلی بیڑی ایک کان سے برآمد کرہی لی۔

مجھے نواب صاحب کی ان باتوں پر اب بالکل ترس نہ آتا تھا۔ ترس آنے کا زمانہ گزر چکا تھا۔ شروع شروع میں میرا دل بھی مسّلا کرتا تھا اُن کے لئے کہ خدایا تو کسی کو اچھے دن ہی نہ دکھائے یا پھر یہ بُرے دن نہ دکھائے جہاں تک مجھ سے ہوسکا میں نے اُن کی مدد بھی کی۔ اُن کے قرض کے بار مطالبے کی میں نے تعمیل کی۔ اور یہ سمجھ کر تعمیل کی کہ یہ قرض نہیں ہے

بغیر اُن کے مانگے بھی جو کچھ میرے امکان میں ہوا پیش کرتا رہا۔ مگر جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ در اصل میں دوستی کے پردے میں یہ دشمنی کر رہا ہوں، اُس وقت سے میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ابھی پچھلے ہی دنوں نواب صاحب کا ایک پرچہ میرے پاس آیا کہ پچاس روپے کی شدید ضرورت ہے ایک ہفتہ کے اندر میرا روپیہ آنے والا ہے۔ فوراً ادا کر دوں گا۔ ہر چند کہ مجھ کو معلوم تھا کہ روپیہ آنے والا بھلا کہاں سے ہوتا۔ میں نے پچاس روپے حاضر کر دیئے۔ لیکن تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ جب اسی دن نواب صاحب نے خود آواز دے کر مجھے بلایا۔ اور جب میں پہنچ گیا تو چوڑی دار پاجامے کی چوڑیاں ترتیب دیتے ہوئے بڑی قاتلانہ مسکراہٹ سے فرمایا۔

"چلیئے آج آپ کو گانا سنواؤں۔"

میں سمجھا کہ ہوگا کہیں گانا وانا۔ اس لئے معذرت خواہ ہو کر عرض کیا:
"معاف کیجئے گا، میں بغیر براہِ راست دعوت کے کہیں جانے کا قائل نہیں ہوں۔"

نواب صاحب نے بُرا مان کر کہا: "اور براہِ راست دعوت کسے کہتے ہیں۔ دعوت دے تو رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ بی چھمی جان نے اب واقعی ناک میں دم کر دیا ہے۔ مہینوں سے بلا رہی ہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک زمانے میں اُن سے یادِ اللہ رہ چکی ہے۔ اب وہ سمجھتی ہیں کہ میں بے وفا نکل گیا۔ لیکن یہاں یہ حال ہے کہ ـــ

ماں جو جائیں گرہ میں مال کہاں ؟

کل ماں کا بہت ہی طنز آمیز خط آیا ہے کہ اب تم میرے جنازے ہی پر آؤ گے ! اس لئے آج جانا ہی پڑا ۔ مگر روح تازہ ہو جائے گی آپ کی اُس سلکانا سُن کر ۔ کیا گلا پایا ہے اور کیا طبیعت داری ہے اور نرت میں تو وہ کمال حاصل ہے کہ " بن پانی چلا جائے رے بجرات کی نرت ایک مرتبہ اس نیک بخت نے رات کو دس بجے سے جو شروع کی تو صبح کے چار بجا دیئے مصوری کرتی ہے بخدا ! بہر حال اب آپ دیکھ ہی لیجئے گا ۔"

جی تو نہ چاہتا تھا اس لغویت میں مبتلا ہونے کو ۔ لیکن مجھے جان سے زیادہ خود حضور نواب صاحب کی نرت دیکھنے کا اشتیاق تھا ۔ کہ یہ لنگوٹی میں پھاگ کیسے کھیلتے ہیں ۔ اس لئے میں تیار ہو گیا ۔ مجھے تو خیر تیار ہونا ہی کیا تھا ۔ تیار تو نواب صاحب ہو رہے تھے ۔ اور دراصل یہ تیاریاں صبح سے جاری تھیں پہلے جوتے کی مرمت کرا کے اُس پر پالش کرائی ۔ پھر انگرکھا نکال کر دھویا ۔ اُس میں کلف دیا ۔ اور جب وہ سوکھ گیا تو اُس کی آستینیں چُنی گئیں ، سلوٹیں برابر کی گئیں ۔ کرتے کی آستینیں بھی پاندان کے ڈھکنے سے گاؤ تکیے پر چُنی گئیں ۔ آنکھوں میں سرمہ لگا ۔ چنبیلی کے تیل سے پٹیاں چکنائی گئیں ۔ نہ جانے کب کا چکشا ہوا عطر ملا گیا ۔ اور اب چوڑی دار پاجامے کی چوڑیاں مرتب فرما کر وہ مرمت شدہ جوتا پہنا گیا ۔ اتنے میں علیا حضرت شہزادی صاحبہ محلسرا سے پان بنوا کر لے آئیں ۔ یکمشت تین چار گلوریاں گلے میں دبائی گئیں ۔ تاکہ پکھراج کا نرالی کلہ مخلّہ پیدا ہو جائے ۔ اس کے بعد دیر تک

آئینے سے مشورہ کر کے دوپلّی ٹوپی کا زاویہ قائم کیا گیا۔ مختصر یہ کہ غارت گری کے تمام اسلحہ سے مسلّح ہو کر آپ تشریف لے چلے۔ اور اب جو چھمّی جان کے بالاخانے پر پہنچے ہیں تو شان ہی کچھ اور تھی۔ اُدھر سے بے وفائی کے طعنے، اِدھر سے مصروفیت کے ایسے ایسے عذر کہ میں چوندھیا کر رہ گیا۔ اُس پر طرّہ یہ کہ گواہی میری پیش ہو رہی تھی۔ مثلاً کہنے لگے۔

"تمہاری قسم چھمّی جان سر کھجانے کی مہلت نہیں ملتی۔ ریاست کے جھگڑے بکھیڑے تو تھے ہی، اس پر طرّہ یہ کہ ان حضرت کے ایسے کرم فرماؤں نے الکشن میں کھڑا کر دیا ہے۔ ووٹروں کی فہرستیں مرتب ہو رہی ہیں مختلف محلوں میں جلسے ہو رہے ہیں۔ ابھی یہاں ہوں تو ابھی وہاں۔ اس وقت بھی ایک جلسے میں جانا تھا۔ مگر تمہارا یہ خط دیکھ کر میں نے کہا کہ اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے گی۔ مگر آج حاضری ضرور دوں گا۔ ارے بھئی یہ بیٹھے ہیں۔ اِن سے پوچھ لو۔ کہ مقابلہ کس قدر سخت ہے۔"

چھمی جان نے کہا۔

"بھاڑ میں جائے ایسا الیکشن موا، کہ آدمی کو تن بدن کا ہوش نہ رہے ذرا اپنی صحت تو دیکھئے کیا حال بنا رکھا ہے اپنا۔"

نواب صاحب نے بات ٹالنے کو کہا۔

"خیر چھوڑو اِس ذکر کو۔ ذرا دل بہلانے کا سامان کرو۔ میرے یہ دوست بھی گانے کے رسیا ہیں۔ بس وہ کمال دکھاؤ کہ یہ بھی قائل ہو کر

جائیں یہاں سے۔"

اِس اشارے کی دیر تھی۔ سازندے جو اُونگھ چکے تھے چونک اُٹھے سارنگی ریتی جانے لگی۔ طبلے پر طبلچی کے ہاتھ اُچھلنے لگے۔ اور چھمی جان نے بڑے نخروں کے بعد اب جو آواز نکالی ہے تو اندازہ ہوا کہ آج گانے کا غالباً پہلا اتفاق ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اِس قسم کی آواز چورن بیچنے کے لئے جتنی مناسب ہو سکتی ہے۔ اتنی ہی گانے کے لئے نامناسب ہے۔ مگر ہمارے نواب صاحب نے، خدا اُنھیں غارت کرے۔ نوٹ پر نوٹ دینا شروع کئے۔ اگر میرا حساب درست ہے۔ تو نواب صاحب نے چالیس روپے کے لگ بھگ اُس بیہودہ گانے پر اس نامعقول گانے والی کو دے دیئے۔

میرا اندازہ یہ ہے۔ کہ دس روپے کے لگ بھگ یہاں آنے کی تیاری میں نواب صاحب نے صرف کئے ہوں گے۔

قصہ مختصر یہ کہ جب یہ جھک مار کر نواب صاحب رات کو واپس تشریف لائے تو گھر پہنچکر انھیں مجھ ہی سے کہنا پڑا کہ۔ "تانگے والے کو کرایہ دے دیجئے۔ میں تو سب کچھ صرف کر آیا۔ مگر شکر ہے کہ بات بنی رہی۔ چھمی جان کی نظروں میں ذلیل نہیں ہوا۔"

اب آپ ہی بتایئے کہ اِس تجربے کے بعد مجھے نواب صاحب سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ میں اُن کی یہ حالت دیکھتا رہتا ہوں

اور اس طرح کی ہر حالت کو حق بجانب سمجھتا ہوں۔ رہ گیا محلسرا اور رہ گئی حرم کی حالتِ زار، اس کی اصلاح کی میرے نزدیک تو صرف ایک صورت ہے۔ کہ نواب صاحبہ تبدیل آب و ہوا کے لئے کچھ دنوں کے واسطے جیل چلے جائیں۔ مگر قیدِ بامشقت ہونی چاہیے!

⁂

کانا پردہ

برقعہ کا مصرف یہی ہے نا کہ اس کو اوڑھ کر مستورات گھر کے باہر جاتی ہیں؟ مگر ہمارے یہاں برقعہ اس لئے ہوتا ہے کہ اسے اوڑھ کر بیگم صاحبہ گھر میں آتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ نامحرموں سے پردا کرنا اتنا ضروری نہیں سمجھتیں جتنا محرموں سے پردہ ان کے لئے ضروری ہے۔ بہتر ہے کہ اس معمے کو جلد سے جلد حل کر دیا جائے تاکہ غور و فکر میں دماغ خواہ مخواہ الجھا نہ رہے۔

صاحب بات یہ ہے کہ میں پردے اور بے پردگی کی بحث میں تو پڑنا نہیں چاہتا ورنہ بہت سی شرعی اور سماجی بحثیں اس شدت سے چھڑ جائیں گی کہ شاید خود مجھ کو پردہ نشین ہو جانا پڑے۔ اخلاقی جرأت سے کام لے کر صرف یہ عرض کرنا ہے میں چاہتا ہوں کہ میری بیوی پردہ نہ کریں اور سچ تو یہ ہے کہ وہ خود بھی یہی چاہتی ہیں مگر ہم دونوں اس سلسلہ میں کچھ ایسے مجبور ہیں کہ اپنی اس خواہش کو

چوری چھپے ہی پورا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ وہ نہایت اہتمام سے برقعہ اوڑھ کر گھر سے نکلتی ہیں اور جہاں گھر سے ذرا دور گئیں۔ برقعہ اتر کر ان کی بغل میں آجاتا ہے اور وہ بے پردہ پھرتی رہتی ہیں مگر واپسی میں جیسے ہی گھر قریب آتا ہے وہ پھر برقعہ اوڑھ کر گھر میں داخل ہو جاتی ہیں اور وہ تمام بزرگ مطمئن رہتے ہیں۔ جن کی قسمت سے اس نئی روشنی میں اطمینان اٹھ چکا ہے۔

گھر کے دیگر بزرگوں کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں اگر صرف حضرت صاحب ذرا روشن خیال ہو سکتے تو ان چوریوں کی نوبت نہ آتی مگر وہ بھلا ہوتے ہی کیوں روشن خیال یہ ان ہی کی شدت پسندی تو ہے کہ باوجود عاقل بالغ ہونے کے ابھی اتنی مجال نہیں ہے کہ کسی اور کا بھی نہیں اپنی ذاتی بیوی کا پردہ اٹھوا دیں۔ حضرت صاحب کے احکام سے انحراف کی جرات ہم تو ہم ہمارے بزرگ تک نہیں کر سکتے۔ ہمارے گھر پر ان کی حکومت ہے۔ ان کے چشم و ابرو کے اشاروں پر ہمارے وہ محترم بزرگ ناچتے پھرتے ہیں جن کی اطاعت خود ہمارے لئے باعث سعادت ہے۔ بات یہ ہے کہ دیکھئے والد محترم کے پیر اور والد محترم کو جو عقیدت اپنے پیر سے ہے اس کا مقابلہ نہ زوجہ کی زوجیت کر سکتی ہے نہ اولاد کی محبت اگر حضرت صاحب اشارہ بھی کر دیں تو وہ سب کو چھوڑ کر اپنے پیر کی خوشنودی حاصل کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے گھر میں صرف حضرت صاحب کے نام کا سکہ چلتا ہے اور وہی ہوتا ہے جو حضرت صاحب چاہتے ہیں بات یہ ہے کہ جو اس گھر کا آقا ہے وہ حضرت صاحب کا غلام ہے لہذا ہم کس کھیت کی مولی ہو سکتے ہمارا شمار تو گویا غلامان غلام ہی میں ہو سکتا ہے۔

اگر سچ پوچھئے تو خود ہمارے لئے وہ زمانہ سخت آزمائش کا ہوتا ہے جب حضرت صاحب قبلہ تشریف لائے ہوئے ہوتے ہیں کہ خدا جانے وہ کس بات پر اعتراض فرمادیں؟ ہماری کون سی بات مزاجِ اقدس کے خلاف گزر جائے؟ اگر خدا ناخواستہ وہ ناراض ہوگئے تو دین سے زیادہ دنیا خراب ہوکر رہ جائے گی۔ والد صاحب بمشکل ہی زندہ چھوڑیں گے، ماں کی مامتا بھی کام نہ آسکے گی، اس لئے کہ ان کو بھی حضرت صاحب کی عقیدت سے زیادہ دنیا کی کوئی چیز عزیز نہیں ہے مگر باوجود انتہائی احتیاط کے اب یہ بھی ہماری قسمت کہ "جل تو جلال تو" کا وظیفہ پڑھتے جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے حضرت صاحب کی کڑک دار آواز بجلی کی طرح ہماری سماعت پر گری صاحبزادے ادھر آیئے ـــ"

حواس بجا ہوئے تو اندازہ ہوا کہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ حضرت صاحب کے تمام حلقہ بگوش جن میں والد صاحب بھی شامل تھے قہر آلود نگاہوں سے ہم کو گھو میں دیکھ رہے تھے اور خود حضرت صاحب کی نگاہوں میں تو سچ مچ قہر و غضب کی بجلیاں نگاہیں کوندرہی تھیں یہ حضرت صاحب کا جلال ہی تو تھا جس سے در و دیوار تک بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے اور اپنا تو یہ حال کہ۔

"ایک مجرم کہ نہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع"

ابھی قریب پہنچ کر عادتاً دست بوسی کے لئے بڑھنا ہی چاہا تھا کہ حضرت صاحب نے نہایت قہر آلود لب و لہجہ کے ساتھ فرمایا "اس ارادے سے پہلے اپنے نفس کا جائزہ لیجئے صاحبزادے، اپنے اعمال کے آئینے میں اپنا وہ عکس دیکھنے کی کوشش کیجئے جس کے بعد آپ شاید خود اپنے کو ایک مومن ہی نہیں بلکہ ایک...

شریف زادہ بھی نہ کہہ سکیں۔ مجھ کو نہیں معلوم تھا کہ آپ خدا اور رسول کے علاوہ اپنی خاندانی شرافت کو بھی اس حد تک بھولے ہوئے ہیں ۔۔۔۔

میں سر جھکائے یہ سب کچھ سنتا رہا اور سچ تو یہ ہے کہ دماغ اس قابل تھا ہی کب کہ کچھ غور کر سکتا۔ کوئی فیصلہ کر سکتا کہ آخر یہ کس غلطی کی سزا مل رہی ہے بہرحال یہ طے تھا کہ غلطی ہوئی ضرور ہے اور وہ کوئی معمولی نہیں بلکہ نہایت شدید غلطی ہے۔ حضرت صاحب کے الفاظ تازیانہ بن بن کر دماغ پر برستے رہے یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے بعد ان الفاظ نے رعد و برق کی سی کیفیت اختیار کر لی اور مفہوم سمجھنے کی تاب بھی چھین لی گئی۔ آخر یہ طوفان تھما اور حضرت صاحب نے ایک لمحہ سکوت فرمانے کے بعد فرمایا: "تشریف لے جایئے اور اگر آپ کا ضمیر اب تک حیات ہے تو وہ آپ کو خود بتلائے گا کہ میں نے آپ کو ننگِ خاندان کیوں کہا ہے تشریف لے جایئے۔"

میں اپنا چکرایا ہوا دماغ لئے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ فوراً وہاں سے سر جھکائے چلا آیا اور اب تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کچھ ہوا کیا ہے۔ غلطی تو ضرور ہوئی ہے مگر وہ غلطی ہے کیا ؟

زنانہ مکان میں پہنچا تو والدۂ محترمہ نے ایک آہ سرد بھر کر مونہہ پھیر لیا میں نے غور سے دیکھا اور اپنی نگاہوں کی تمام حقارت برسا کر اپنے کمرے کا رخ کیا۔ ملازموں نے دیکھا تو ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ جانے کیا باتیں شروع کر دیں۔ مختصر یہ کہ اپنے کمرے تک پہنچنا دوبھر ہو گیا اور اپنے کمرے میں جو منظر دیکھا اس نے رہے سہے ہوش بھی اڑا دیئے۔ وہ اپنے بستر پر پڑی ہچکیوں میں

موہنہ چھپائے ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھیں۔ پہلے تو خود بھی سر تھام کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے مگر آخر کب تک؟ اپنے کو سنبھالا اور ان کو سنبھالنے کے لئے بڑھ کر ان کے شانے پر ہاتھ ہی رکھا تھا کہ وہ تو اور بھی پھوٹ پڑیں اور اب سمجھ میں آیا کہ غالب نے کتنی سچی بات کہی تھی کہ ؎

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ بس جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

اس قسم کے موقعوں پر ایک اختلاجی آدمی عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہے چنانچہ وہ تمام حرکتیں ہم نے بھی کیں۔ لاحول ولاقوۃ کہہ کر اچھلے، کلیجہ تھام کر بیٹھ گئے۔ پھر اٹھ کر قریب گئے اور نہایت نامکمل سا جملہ کہا "ارے بھئی خدا کے لئے پھر کچھ اور بے معنی الفاظ کہے۔ یعنی گویا خواہ مخواہ بھی۔" اور آخر کار دل کو مضبوط کر کے ایک فیصلہ کن انداز میں کہا "میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ ہو کیا رہا ہے۔"

وہ گلوگیر آواز میں بولیں۔ "مگر میری سمجھ میں آچکا ہے کہ یہ سب میری قسمت کے کھیل ہیں۔"

میں نے اب ان کے قریب آ کے کہا۔ "اگر آپ کی سمجھ میں آچکا ہے تو اس سے قبل کہ میں پاگل ہو جاؤں مجھ کو بھی سمجھا دیجئے۔"

وہ اپنی سوجی ہوئی آنکھوں سے مجھ کو دیکھ کر بولیں "کس قدر معصوم بننے کی کوشش کر رہے تھے آپ، مگر یہ بھی سن لیجئے کہ مجرم سے زیادہ اس کے جرم کو اور کوئی نہیں جانتا ہم سب سے زیادہ آپ کو خود معلوم ہے کہ آپ نے

کیا کیا ہے؟"

میں نے اب مشتعل ہو کر کہا "اب میں اپنا سر پھوڑ لوں گا ورنہ مجھ کو بتائیے کہ میں نے کیا کیا ہے؟"

وہ نہایت تلخ طنز کے ساتھ روتے روتے مسکرا کر بولیں "چوری کے بعد اب سینہ زوری کے جوہر بھی آپ دکھا رہے ہیں یہ فریب اب وہی بیگم صاحبہ کھلائیں گی جن کے ساتھ نہایت بے حیائی کے ساتھ آپ سیر سپاٹے کرتے پھرتے ہیں"

میں نے ایک دم چونک کر کہا "بیگم صاحبہ؟ کیسی بیگم صاحبہ؟"

وہ اسی تلخی کے ساتھ بولیں "بس اب رہنے بھی دیجئے آنکھوں میں دھول جھونکنے کو۔ کوئی اور کہتا تو شاید مجھ کو یقین۔ نہ آتا۔ مگر یہ بھی آپ کی قسمت کہ خود حضرت صاحب نے آپ کو ان بیگم صاحبہ کے ساتھ گل چھرے اڑاتے دیکھا ہے۔ اور وہیں کچھ گھر میں پردہ کرا کے تشریف لائے تھے اور خاص طور پر میرے متعلق فرمایا کہ اس نامراد کو دروازے کی آڑ میں بلا لو تاکہ میں اس پر یہ بجلی گرا دوں کہ اس کی زندگی کا ساتھی کسی اور کا ساتھ دے رہا ہے ـــــ"

میں نے ہکا بکا ہو کر کہا "یہ آپ کہہ کیا رہی ہیں، حضرت صاحب تو آج ہی تشریف لائے ہیں نا؟"

وہ بدستور برہمی سے بولیں "جی ہاں۔ مگر یہ واقعہ ایک ہفتہ قبل کا ہے جب حضرت صاحب یہاں قیام کرنے کے بعد واپس تشریف لے جا رہے تھے اسی دن وہ آپ کی محبوبۂ دل نواز کے ساتھ دیکھ چکے تھے اور اسی دن سے اس

کرب میں مبتلا تھے کہ ان کی اس توجہ کے بعد آپ اخلاقی طور پر اس حد تک گر چکے ہیں، وہ مجھ کو سمجھاتے رہے۔ تسلیاں اور دلاسے دیتے رہے اور یہ بھی فرمایا کہ وہ آپ کے لئے دعا بھی فرمائیں گے۔ مگر میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ کیا میری تمام وفاؤں کا یہی صلہ تھا ــــ"

میں نے الجھ کر کہا "صاحب ٹھہرئیے تو مجھ کو ذرا یاد تو کرنے دیجئے۔ پچھلی مرتبہ جب حضرت صاحب تشریف لے گئے ہیں تو اسی دن آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ خدا خدا کر کے اب وہ گئے ہیں تو اب سینما دکھا دیجئے۔"

وہ بولیں "جی ہاں مجھ کو یاد ہے مگر اس سے پہلے ہی وہ آپ کو ان بیگم صاحبہ کے ساتھ دیکھ چکے تھے میں تو ان کی روانگی کے بعد سینما گئی تھی نا۔"

میری سمجھ میں پوری بات آچکی تھی لہٰذا میں نے متحیر ہو کر کہا "عقلمند بیوی ذرا عقل سے کام لو۔ حضرت صاحب ہمارے گھر سے رخصت ہو کر مزارات پر فاتحہ خوانی کے لئے گئے اور ہم دونوں سینما دیکھنے چلے۔ حضرت صاحب نے آپ کو کبھی دیکھا نہیں ہے اور وہ آپ کو پردہ نشین، برقعہ پوش سمجھتے ہیں مگر آپ کا برقعہ آپ کی بغل میں تھا چنانچہ وہ سوائے اس کے اور کیا سمجھ سکتے تھے جو کچھ وہ سمجھے۔"

اب بیگم صاحبہ نے بھی ذرا عقل سے کام لینا شروع کر دیا۔ اور کچھ غور فکر کر کہا "یعنی آپ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے شہر سے رخصت ہونے سے قبل میں آپ کے ساتھ بے پردہ شکل کھڑی ہوئی اور ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی ــــ ہائے اللہ یہ تو بہت برا ہوا۔"

میں نے کہا "جی نہیں یہ اُس سے بہت اچھا ہوا جو کچھ سمجھا جا رہا ہے۔"
بیگم صاحبہ نے ایک دم جست لگا کر میز سے اپنی تصویر اٹھا لی اور مجھ سے کہا۔ "حضرت صاحب سے پوچھ آتی ہوں کہ میں کتنی زیادہ چڑیل ؟"
میں نے کہا "یہ بات تو صاف ہو ہی جائے گی مگر بے پردگی کا جرم عائد ہو جائے گا۔ اس کا کیا جواز پیش کر دیں گی۔"

وہ چھلاوے کی طرح تصویر لے کر کمرے سے غائب ہو گئیں اور میں اب اس دوسرے الزام کے سلسلے کی جوابدہی کے لئے الفاظ ڈھونڈھنے لگا کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ ایک جرم سے بری ہو بھی گئے تو کیا ہونا ہے دوسرا جرم بجائے خود نہایت سنگین ہے۔ بے پردگی کا قصور حضرت صاحب شاید ہی معاف کریں مگر اطمینان تھا تو یہ کہ اب جرم کا ایک ساتھی بھی مل گیا یعنی خود بیگم صاحبہ میں بھی اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ کمرے کے باہر حضرت کی آواز آئی۔

"لاحول ولا قوۃ"

اور فوراً ہی حضرت صاحب کمرے میں تشریف لے آئے۔ "یعنی عجیب عقلمند انسان ہیں آپ بھی صاحبزادے، کہ میری خفگی سنتے رہے اور مونہہ سے نہ بولے تمہاری خاموشی نے تمہارے جرم کو اقبال جرم بنا دیا۔ حالانکہ کوئی جرم ہی نہ تھا۔ میں نے تمہاری ہی بیوی کو دیکھا تھا جو رواجی پردے کے باہر تھیں مگر شرعی پردے کے اندر تھیں۔ استغفر اللہ۔ عجیب غلط فہمی پیدا کرائی ہے اس رواجی پردے نے، میں تصور ہی نہ کر سکتا تھا کہ یہ تمہاری بیوی ہو سکتی ہیں۔ استغفر اللہ۔"

⁂

کیا میں شاعر ہوں

اگر آپ شاعر ہیں تو معاف کیجیے گا ، اس لیے کہ مجھ سے ایک بھانڈا پھوڑ حرکت سرزد ہونے والی ہے اور اگر آپ شاعر نہیں ہیں تو ان حقائق و معارف کو دراصل آپ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ کہ جس وقت ایک شاعر کو کسی مشاعرے کا دعوت نامہ موصول ہوتا ہے ، اور اسکے آمد و رفت کے کرایہ کا بھی ذکر ہوتا ہے اُس وقت اُس کا کیا ہوتا ہے جناب والا سب سے پہلے تو اس کو اپنی شخصیت کا احساس کچھ اس شدت سے ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس ہندوستان میں پیدا ہونے پر تعزیت کرنے لگتا ہے ، پھر اپنے ناقدر شناس گھر والوں پر اس کو دل ہی دل میں غصّہ آتا ہے کہ یہ سب کے سب جہل مرکب میری شخصیت کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں۔ گھر کی مرغی ہوں دال برابر سمجھ رکھا ہے صاحب کون دکھائے ان عقل کے اندھوں کو یہ دعوت نامہ کہ ہم وہ ہیں جس کو اتنی بڑی

اشادہ کی نمائش میں مدعو کیا گیا ہے کہ آ کر بزمِ مشاعرہ کو زینت دو۔ اور اپنے کلام جو بلاغت نظام بھی ہوتا ہے۔ حاضرینِ بزم کی عقیدت حاصل کرو۔ اس کے بعد اس کا دماغ مشاعرے کا ایک تخیل پیدا کرتا ہے کہ ایک وسیع پنڈال ہوگا گیس کے ہنڈوں سے جگمگاتا ہوا۔ قالینوں سے آراستہ مسندوں سے سجا ہوا۔ اس میں سامعین کا اژدہام ہوگا۔ جو مشاعرے کی دھوم سن کر دور دور سے جوق در جوق آئیں گے۔ وسط میں شعرائے کرام کا دور ہوگا جن کے سامنے گلدان قرینے سے رکھے ہوں گے۔ پیچوان لگے ہوں گے خاصدان گردش میں ہوں گے اور حاضرینِ مشاعرہ کی نگاہیں ہر آنے والے شاعر کے لئے اٹھ اٹھ کر فرشِ راہ ہوں گی جب ہم پہونچیں گے تو مشاعرے کے سکریٹری صاحب بڑھ کر ہمارا خیر مقدم کریں گے۔ منتظمین ایک دوسرے سے ہمارا نام لے کر کہیں گے۔ کہ وہ آ گئے یہاں تک کہ سارے پنڈال میں ہمارا نام گونج جائے گا اور جیسے ہی ہم پنڈال میں داخل ہوں گے۔ تمام پنڈال تالیوں سے گونج اٹھے گا لوگ اٹھ اٹھ کر ہم کو دیکھیں گے۔ اور ہم مسکرا مسکرا کر گردن کی خفیف جنبشوں سے اس خیر مقدم کا پندار آمیز شکریہ ادا کرتے ہوئے شعراء کی صف میں نہایت ممتاز جگہ جا کر بیٹھ جائیں گے۔ اس کے بعد شاعر کے دل میں ایک یہ بھی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش اس موقع پر گھر کے اور لوگ نہ سہی کم از کم گھر والی ہی وہاں موجود رہ کر اپنے اس شوہر کی عزت و تکریم دیکھے۔ جس کو اس نے محض شوہر ہونے کے جرم میں بالکل ہی حقیر و ذلیل سمجھ رکھا

ہے اور اس کو یہ پتہ نہیں کہ اُن کا یہی شوہر مشاعرے کی دنیا میں کس مرتبہ کا انسان ہے۔

بہر صورت اپنی خیالات میں مجوزہ کردہ مشاعرے کی شرکت کے تمام انتظامات کرتا ہے۔ حاضرین مشاعرہ چونکہ کلام سے زیادہ لباس مرعوب ہوتے ہیں، لہٰذا غزل کہنے سے پہلے شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ آخر کار نکل ہی آتا ہے۔ مشاعرے کی فرشی محفل کے لئے موزوں کا خیال خاص طور پر رکھنا پڑتا ہے۔ کہ ان کی خستگی غزل کو نہ لے ڈوبے اور چونکہ یہ واقعہ ہے کہ حاضرین مشاعرہ صرف کانوں سے سُنتے ہی نہیں بلکہ شاعر کو آنکھوں سے دیکھتے بھی ہیں۔ اور سب کی نظریں اُسی پر جم کر رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا یہ بھی طے ہے کہ مشاعرے کے لئے بال بنوا کر غسل کرنا۔ غسل کرکے چہرے پر اسنو اور کریم وغیرہ رگڑنا۔ مونچھوں پر تاؤ دینا اور اگر مونچھیں نہ ہوں تو ابرو کو نوک پلک سے درست کرنا۔ خوشبو لگانا۔ آئینہ کے سامنے بار بار اپنا جائزہ لینا۔ لباس پر تنقیدی نظر ڈالنا اس کے پہننے کے طریقوں کو پرکھنا وغیرہ نہایت ضروری ہے۔ شاعر یہ سب کچھ کرتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ مثلاً ہمارے ایک عزیز شاعر دوست ہیں جن کو خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ میری آنکھوں میں خاک ان کے چہرے پر عجیب سی دلکشی پائی ہے۔ اگر وہ آئینہ خانہ میں بال بال موتی نہ بھی پرو دیں تو خدا نے صورت ایسی دے رکھی ہے کہ

ہزار دو ہزار میں ایک ہیں مگر حال یہ ہے کہ مشاعرے کا نام آیا اور وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ حسن کا مقابلہ ہے۔ طرح طرح کے میک اپ شروع ہو گئے۔ حمام اور غسل خانہ۔ آئینہ اور شانہ۔ بالوں میں انزورا تو رخساروں پر ابٹن کپڑوں پر یارڈلے تو رومال پر کوٹی۔ پھر یہ کہ پاجامے کی چوڑیاں پنڈلیوں سے ٹخنوں تک سنٹی میٹروں سے ناپ کر برابر برابر رکھی جاتی ہیں موزے اور جوتے میں اس طرح ربط قائم کیا جاتا ہے جو دو مصرعوں میں ہونا چاہئے شیروانی کے ایک ایک بٹن کو دیکھا جاتا ہے کہ کہیں وزن گر تو نہیں رہا ہے۔ ٹوپی کے زاویہ کو آئینہ کے سامنے درست کر کے قائم کیا جاتا ہے کہ مبادا اس میں تعقید کا نقص پیدا ہو جائے یہاں تک کہ جب وہ اس مشاعرہ لوٹنے کیلئے گھر سے چلتے ہیں تو راستے میں شیروانی کے نیچے ملاڈی کالر لگا کر ادبی غارتگر بننے کا خیال آتا ہے اور اس خیال کی تکمیل راستے ہی میں ہو جاتی ہے۔ حالانکہ غزل پڑھنے کیلئے آپ عین مشاعرے میں مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس کالر کا بٹن کھول دیں اور بٹن کھلنے کے بعد آپکو خود معلوم ہوگا کہ ملاڈی کالر کی کیا قطع ہو جاتی ہے اور وہ کالر لگانے والے کو کس قدر بد قطع بنا دیتا ہے۔ خیر وہ تو حسین ہیں۔ جمیل ہیں۔ شکیل ہیں۔ مگر وہ شاعر بھی جو ان نعمتوں سے محروم ہیں اپنی اپنی بساط کے مطابق تکمیل حسن کرتے ہیں۔ اور سب کی در پردہ خواہش یہی ہوتی ہے کہ مشاعرے میں غزل تو خیر بعد میں چمکے گی پہلے وہی چمک لیں لباس اور زیبائش کے بعد دوسری ضروری چیز آواز ہے۔ جس سے عام طور پر کلام کے نقائص پر پردہ ڈال کر کم سے کم مشاعرے میں غزل کو چمکانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلئے کہ اس کے بعد کاغذ

پر آکر تو وہ غزل محض غزل رہ جاتی ہے۔ راگ راگنیوں اور الاپ وغیرہ سے محروم، نہ وہاں آواز کا رس غزل کو چمکانے میں مدد دیتا ہے۔ نہ گلے بازی کام آتی ہے۔ بہرحال ہر شاعر کا مقصد بھی یہ نہیں ہوتا کہ مشاعرے کے بعد بھی اُس کی غزل زندہ رہے بلکہ مطلب تو صرف اس سے ہوتا ہے کہ مشاعرے میں کسی طرح شعر پڑھ کر تسلیم کرنے کا موقع مل جائے۔ اس قسم کے شعرائے کرام کو اپنے رودادیں چھپوانے کے لئے اُس وقت کا انتظار ہے۔ جب دیوان کاغذ پر چھپنے کے بجائے گراموفون ریکارڈوں میں بھرے جایا کریں گے۔ اور لوگ ان کو آنکھوں سے پڑھنے کی جگہ آنکھ بند کرکے اور عقل کو بالائے طاق رکھ کر محض کانوں سے سُنا کریں گے خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا مقصد کہنے کا یہ کہ مشاعرے میں کامیابی کا چونکہ بہت کچھ دارو مدار آواز پر ہے۔ لہذا غزل خواہ کیسی بھی ہو مگر ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ ترنم ذرا دلکش قسم کا تصنیف ہو جائے۔ چنانچہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ مشاعرے میں شرکت کا ارادہ اپنے ساتھ ہی شاعر کے کچھ ایسے نغمے بھی لاتا ہے جن کی مشق ارادی اور غیر ارادی طور پر گویا شاعر کا وظیفہ بن جاتی ہے۔ غسل خانہ ہے وہ ترنم سے گونجا ہوا۔ تبدیل لباس کا وقت ہے تو بھی ترنم جاری ہے بالوں کو آراستہ کیا جا رہا ہے تو ترنم کے ساتھ۔ گویا لوری سُنا سُنا کر ایک ایک بال کو بچوں کی طرح سلایا جا رہا ہے مختصر یہ کہ دعوت نامہ آنے کے بعد سے لیکر مشاعرے تک شاعر جدھر بھی ہو کر گزر جاتا ہے کچھ نغمے بکھیر دیتا ہے۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ وہ نغمے کیسے ہوتے

ہیں اُن کا دراصل سنگیت ودھیا سے تو دور کا ناطہ نہیں ہوتا البتہ کوئی صاحب تو مفلوج قسم کے مالکوس میں فرماتے ہیں۔ کوئی صاحب مدقوق قسم کی اساوری میں نغمہ ریز ہوتے ہیں۔ کوئی صاحب مجروح قسم کی بھیرویں کا انتخاب فرماتے ہیں اور کوئی صاحب اپنے لئے کچھ بین الاقوامی قسم کی موسیقی تجویز فرماتے ہیں۔ یہ تو صرف ان لوگوں کا ذکر ہے جو خوش آواز واقع ہوئے ہیں ورنہ اس مشاعرے کی دنیا میں تو ایسے ایسے صاحبان کمال پڑے ہوئے ہیں کہ ترنم تو درکنار معمولی آواز میں تمام خوفناکیاں موجود ہیں مگر وہ ہیں کہ گا رہے ہیں اور اس طرح گا رہے ہیں کہ مائیں اپنے بچوں کے دھڑکتے ہوئے دل کلیجے سے لگائے بیٹھی ہیں پڑوسی مکان بدلنے کا پختہ ارادہ کر چکے ہیں۔ راستہ چلنے والے اِدھر اُدھر منہ اٹھا کر دیکھتے جاتے ہیں کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے اور آسیبی خلل آخر کس مکان میں ہے۔ مگر وہ ہیں کہ اپنا منہ کھول کر "غالباً" کان بند کئے ہوئے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ اس وقت کا قنات پر زمزمہ کی بارش ہو رہی ہوگی۔ ذرہ ذرہ عالم رقص میں ہوگا اور ارض و سماء وجد میں مبتلا ہوں گے۔ کاش اُن کو اپنی اس حشر خیز بد آوازی کا احساس ہوتا۔ مگر اقلیدس میں آیا ہے کہ شاعر اور احساس وہ متوازی خطوطِ مستقیم ہیں جن کو خواہ کتنا ہی بڑھائے وہ آپس میں کبھی یکجا نہیں ہوتے۔

اس وقت شعرائے کرام کا درجۂ حرارت ناقابلِ بیان ہو رہا ہوگا۔

اور جو قصائد اس خاکسار کی شان میں جا بجا ارشاد ہو رہے ہوں گے۔ ان کا بھی کچھ نہ کچھ اندازہ اس غریب کو ہے۔ شعرائے کرام برا نہ مانیں یہ خاکسار خود بھی تخلص پوش اور دیوان فروش واقع ہوا ہے۔ گھر کا بھیدی یہ لنکا ڈھا ضرور رہا ہے مگر خود بھی اس انہدام کا شکار ہونے پر تلا بیٹھا ہے۔ اس کو خودکشی کہئے یا اپنی جماعت کے ساتھ غداری، بہرحال آج تو کچھ سچ بولنے کو ہی دل چاہتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ خاکسار بھی مدتوں اپنے کو شاعر سمجھتا رہا ہے۔ غزلیں کہی ہیں نظمیں فرمائی ہیں۔ مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ شعر و سخن کے معرکوں میں حصہ لیا ہے۔ وفات کی تاریخیں نکالی ہیں۔ شادیوں میں سہرے کہے ہیں۔ اور حد تو یہ ہے کہ ایک صاحب کے خان بہادر ہونے پر نظم تہنیت تک کہی ہے۔ مختصر یہ کہ خدا معاف کرے کون سا گناہ تھا جو سرزد نہیں ہوا۔ ع

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

اب جا کر پتہ چلا کہ کالج کے طالب علم بدتمیز نہ تھے بلکہ حماقت اپنی ہی تھی یہ اگر کوئی شاعرانہ استعارہ ہے تو اس کی شرح آپ خود نہ کریں بلکہ تصنیف را مصنف کا حق ہم ہی کو دیں۔

[۱] ... دراصل یہ ہوا کہ ایک کالج کے سالانہ مشاعرے کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ کالج کا نام بتانے میں پس و پیش صرف اس لئے ہے کہ وہ ایک قومی ادارہ ہے۔ ہم اگر ڈوب رہے ہیں تو شوق سے ڈوبیں مگر اس کو لے ڈوبنے

کا کیا حق ہے۔ بہرحال دعوت نامہ پہلے تو بذریعہ ڈاک موصول ہوا جس کا جواب دینا اسلئے ضروری تھا کہ اس پر لکھا ہوا تھا۔ آل انڈیا مشاعرہ۔ ظاہر ہے کہ آل انڈیا مشاعرے میں آل انڈیا قسم کا شاعر ہی مدعو کیا جا سکتا ہے اور اپنے آل انڈیا شاعر ہونے پر مہر تصدیق ہم اس طرح ثبت کرا سکتے تھے کہ اس دعوت نامے کو منظور کریں اور اس آل انڈیا اجتماع میں شرکت کریں دوسرے اس میں سیکنڈ کلاس کے کرایہ کا تذکرہ کچھ ایسے دل نشین اور متاثر کرنے والے انداز سے کیا گیا تھا کہ ہم اثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔ مختصر یہ کہ سکریٹری صاحب مشاعرے کو لکھ دیا کہ ہر چند کہ گوناگوں مصروفیات کے باعث سفر کرنا اور مشاعرے کے لئے وقت نکالنا دشوار تھا مگر میں نے محض درسگاہ کے خیال سے اپنا پروگرام تبدیل کر دیا ہے اور اس پروگرام کے مطابق مشاعرے میں شریک ہو سکوں گا۔ آپ بواپسی ڈاک زادِ راہ ارسال فرمائیں۔ خط کے آخر میں ایک نوٹ بھی لکھ دیا کہ اگر زادِ راہ بذریعہ تار ارسال فرمائیں تو زیادہ مناسب ہوگا تاکہ کوئی ضروری سے ضروری کام بھی اس پروگرام کو تبدیل نہ کر سکے۔ اس خط کے جواب میں تار کا منی آرڈر وصول ہو گیا۔ اور شاعر نے مشاعرے کے اہتمام شروع کر دیئے۔ غزل کہنے کے لئے طے کر لیا گیا کہ ریل سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ باقی تیاریاں جو غزل سے زیادہ اہم تھیں ہونے لگیں۔ کپڑے جمع کئے گئے۔ ان کی ضروری مرمت ہوئی۔ ہیر کٹنگ سیلون میں خود اپنی مرمت کرائی۔ بستر کی سج دھج کو آل انڈیا مشاعرے کے شایانِ شان اور سیکنڈ کلاس کی مناسبت کے

مطابق بنایا گیا۔ سوٹ کیس کی مرہم پٹی ہوئی۔ بستر بند موچی کی نظر ثانی کے لئے بھیجا گیا۔ جوتوں پر پالش ہوئی۔ اپنی پالش کا سامان خریدا گیا۔ اور آخر کار جب روانگی کا وقت آیا تو پتہ چلا کہ سیکنڈ کلاس سفر اس لئے محال ہے کہ تمہیدی مصارف سے جو رقم بچی ہے وہ کسی طرح کافی نہیں ہو سکتی۔ آخر منزل مقصود سے ایک اسٹیشن ادھر تک انٹر کلاس کا واپسی ٹکٹ لیا گیا۔ اور اس اسٹیشن پر پہنچکر تھوڑے سے فاصلہ کا سیکنڈ کلاس ٹکٹ لے لیا گیا۔ مگر چہرے پر ذرا بھی غیر سیکنڈ کلاسانہ کوئی تاثیر پیدا نہ ہونے دی۔ یہاں تک کہ جب اسٹیشن پر منتظمین مشاعرے نے خیر مقدم کیا ہے تو آپ کا یہ آل انڈیا شاعر بستر تک کھولے اس انداز سے دراز تھا کہ گویا واقعی سیکنڈ کلاس کا ازلی مسافر ہے۔ منتظمین ادب سے بڑھے۔ کسی نے بستر باندھنا شروع کیا۔ کسی نے شیروانی پہنانے میں مدد دی۔ کوئی اٹیچی لے کر اترا تو کسی نے سوٹ کیس سنبھالا۔ یہ آؤ بھگت یہ عزت و تکریم۔ دماغ اور بھی عرش معلے پر پہونچ گئے مگر آپ کو معلوم ہے کہ شامت کبھی متوقع راستے سے نہیں آئی۔ یہاں تو رئیس ابن رئیس بنے ہوئے تھے اور وہاں سوٹ کیس نے یہ گل کھلایا کہ قلی نے جیسے ہی اس کو اٹھانا چاہا اس کے نیچے کا حصہ جو امتداد زمانہ سے محض ایک ہلکے سے ورق کی بساط کا رہ گیا تھا۔ بقیہ سے الگ ہو گیا اور پلیٹ فارم پر تمام کپڑے بکھر کر رہ گئے۔ پاجامہ کہیں جا رہا ہے تو قمیض کہیں ہے۔ موزے

کی ایک فرد کسی خوانچہ والے کی گود میں ہے تو دوسری دہی بڑوں کی ہانڈی میں بھیگ رہی ہے۔ رومال کسی قلی کے پیروں کے نیچے ہے تو ٹوپی کسی کے جوتوں پر پڑی ہوئی ہے۔ داڑھی بنانے کا تمام سامان الگ الگ ہو کر ادھر ادھر منتشر نظر آرہا ہے۔ کالج کے منتظم طالب علم لاکھ طالب علم سہی مگر پھر بھی طالب جو ٹھہرے بہت تہذیب سے کام لیا۔ تو قہقہہ بلند کرنے میں احتیاط برتی مگر منہ پھیر پھیر کر ہنسنے لگے اور پھر اس آل انڈیا مشاعرے کی حواس باختگی سے لطف اندوز ہونے کا تو ان کو بہرحال حق حاصل تھا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ ریل کے سیٹی دیتے ہی اب جو لوٹے کا خیال آیا ہے تو دم ہی نکل گیا۔ اس لئے کہ وہ لوٹا پچھلے اسٹیشن پر دراصل انٹر ہی میں بھول آئے تھے۔ لوٹے کا نعرہ بلند کر کے ادھر جو دوڑے تو طالب علموں نے کہا کہ آپ کا درجہ ادھر نہیں ادھر ہے۔ مگر ان کی سنتا کون ہے۔ انٹر میں جا کر لوٹا اٹھا ہی تو لیا۔ اور اب جو فکر دامنگیر ہوئی کہ اس کی وجہ کیا بتائیں گے تو لگے خود بخود صفائی پیش کرنے کہ ایک صاحب وضو کے لئے مانگ کر لے گئے تھے، ورنہ یہ بھی میرے سامان کے ساتھ ہی سیکنڈ کلاس میں رکھا ہوا تھا۔ کچھ ذہین طالب علم سمجھنے کچھ کودن منہ اٹھا کر رہ گئے اور کچھ شریفوں نے معاملہ کو رفع دفع کر کے پھر چلنے کو کہا۔ اب جب ٹکٹ کلکٹر کو ٹکٹ دکھاتے ہیں تو جلدی میں وہی انٹر والا ایک طالب علم نے برجستگی کے ساتھ کہا۔ "لوٹے کا نہیں اپنا ٹکٹ دکھائیے۔" خفت کی ہنسی ہی دوسرا

کے قہقہوں میں گم ہو کر رہ گئی اور آخر کسی نہ کسی طرح موڑ تک پہونچے ان پے در پے حادثات نے دماغی توازن قائم نہ رکھا تھا۔ ان ہی واقعات کی ادھیڑ بن میں جائے قیام تک پہنچے اور یہاں ہاتھ منھ دھونے کے بعد چائے پی کر غم غلط کرنے کی لاکھ کوشش کی مگر احساس پر وہ تکلیف تھی کہ خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے۔ تمام ولولے سرد پڑ کر رہ گئے تھے۔ مشاعرے کی شرکت کا سارا شوق بدمزہ ہو چکا تھا پھر بھی مشاعرے کے وقت جس وقت ہال میں پہنچے ہیں، بظاہر اپنے کو بشاش اور تر و تازہ بنائے ہوئے تھے۔ مگر عین اس وقت جبکہ ہماری آمد پر ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ ایک آواز آئی لوٹا اور سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا یہاں یہ عالم کہ جسم میں خون منجمد ہو گیا اور جو منجمد ہونے سے بچا وہ پسینہ بن کر بہہ نکلا، قہقہوں کا یہ طوفان تو آیا اور گزر گیا مگر ہم جو ڈوبے تو پھر نہ ابھر سکے۔ یہاں تک کہ جب ہماری باری آئی تو وہ نہ اگلی سی کڑاک تھی، نہ وہ بے باکی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجمع کا رعب کھائے جا رہا تھا۔ جسم تو جسم آواز تک میں بھی لرزش تھی اور ڈائس پر اس انداز کے ساتھ جا رہے تھے جیسے قتل کا مجرم پھانسی کے تختے پر جا رہا ہو ہمارے نام کا اعلان ہوا۔ شاندار الفاظ میں تعارف کرایا گیا۔ ہم سے غزل پڑھنے کی استدعا کی گئی۔ مگر یہاں نہ دل قابو میں تھا نہ دماغ نہ زبان کی لکنت پر کوئی اختیار تھا۔ نہ آواز کی لرزش پر۔ دل پہ جبر کر کے اور ہمت کا آخری سہارا لے کر اب جو ترنم ریز ہوئے ہیں تو

کچھ ایسے مضحک انداز کے ساتھ کہ طالب علم تو طالب سنجیدہ قسم کے سامعین بھی سب ہنس پڑے اور ہنسنے کی بات بھی تھی۔ اپنے نزدیک تو ترنم فرمایا تھا۔ مگر وہاں سنی گئی محض ایک بے ڈھنگی چیخ۔ بہرحال کچھ بھی ہو کسی نہ کسی طرح مطلع پڑھا۔ کچھ ہنستے رہے کچھ نے اخلاقاً داد دی۔ کچھ خاموش رہے اور ایک آواز یہ بھی سنائی دی کہ "کیا لوٹا فرمایا ہے"۔ آخر رہے سہے حواس بھی بجا نہ رہے اور پندرہ شعر کی غزل میں سے صرف تین شعر رکھپ کر پڑھنے کے بعد قہقہوں اور تالیوں کے شور میں ڈائس پر سے اتر آئے۔

احساس کی اذیت سے آخر کار یہی اندازہ ہوا ہم خواہ کچھ بھی ہوں مگر شاعر ہرگز نہیں ہیں۔ ورنہ یہ احساس کیا معنی۔ کہیں متوازی خطوطِ مستقیم بھی ملا کرتے ہیں، اجی توبہ کیجئے۔

⁂

جی ہاں، پٹے ہیں

عاشقی میں تو خیر عزّت مسادات تک چلی جاتی ہے اور اس طرح کہ گویا کوئی بات ہی نہیں۔ لیکن اب معلوم یہ ہوتا ہے کہ مزاح نگاری میں بھی ناک کا جڑ سے صاف ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہ رہے گی اور واقعی جب خود مزاح نگار اپنی برادری کی عزت آبرو کے درپے ہو جائیں گے تو ظاہر ہے کہ مزاح نگاروں کی آبرو ریزی ہوتے ہوئے کیا دیر لگے گی۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیے کہ خود مزاح نگاروں کی برادری کے ایک رکن برادرم مزاح عظیم بیگ صاحب چغتائی المتخلص بہ کرل تار کو جو مار واڑ میں بیٹھے بٹھائے دل لگی سوجھی تو کلکتہ کے ایک اخبار میں یہ تجویز پیش فرما دی کہ ہندوستان کے تمام مزاح نگار خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس سوال کا جواب بصورت مضمون دیں کہ۔ کیا کبھی پٹے ہیں ؟” اور پھر لطف یہ کہ جواب میں پچیس یا

طالب علمی کے زمانہ کی پٹائی سے کوئی بحث نہ کی جائے بلکہ اس مرمت ہونے کا صحیح صحیح احوال درج کیا جائے جو بچپن اور طالب علمی کے بعد یعنی باعزت اور باحیثیت ہو کر اپنی حماقت یا دوسروں کی زیادتی کی بدولت ہوئی ہو اب بتائیے کہ یہ بات تمام عزت و آبرو پر پانی پھیر دینے والی ہے یا نہیں اگر ہم جھوٹ بول کر بچنا چاہیں کہ بھائی یہ اتفاق کبھی ہم کو پیش نہیں آیا تو اس کے واسطے بھی اس ظالم چغتائی نے پیش بندی کر دی ہے کہ " اگر ان حضرات میں سے کسی صاحب نے اس جبر سے انکار کر دیا کہ میں کبھی نہیں پٹا تو بخدا مجھے تو یقین آئے گا نہیں ــ" ایسی صورت میں سوائے صاف صاف عرض کر دینے کے اور کیا چارہ ہے؟

الوداع اے عزت و آبرو، الفراق اے خاندان بھر کی ناک الفراق اگر آپ ایمان کی بات پوچھتے ہیں تو جی ہاں پٹے ہیں۔ اور ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ بار بار پٹے ہیں۔ مگر اس طرح کہ ہم نے بھی پیٹا ہے اور پٹنے کے جواب میں ـــــــ ح

؎ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

خود بھی حریف کو مارا ہے اور ہماری بھی مرمت ہوئی ہے۔ لیکن اس مضمون میں ہم کو اس کا پابند بنایا گیا ہے کہ ہم محض اپنے پٹنے کی داستانیں بلکہ نوحے سے عرض کر دیں۔ لہذا اپنی شجاعت کے افسانوں کا موقع نہیں ہے۔ تاہم اس مضمون کے پڑھنے والوں کو اپنی اپنی جگہ یہ ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔

سائمن کمیشن کی آمد کے سلسلے میں جب لکھنؤ کی فضائیں "گو بیک سائمن سائمن گو بیک" کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھیں اور سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کرنے والوں کے علاوہ بہت سے تماشائیوں کا بھی چار باغ اسٹیشن کے قریب میلہ لگا ہوا تھا ہم کو بھی روزنامہ ہمدم مرحوم کے دفتر سے اٹھا کر اس محشرستان میں بھیج دیا گیا کہ تمام واقعات کی عینی شہادت حاصل کریں اور ہم دفتر سے اٹھ کر تھوڑی ہی دیر کے بعد اس "انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر" میں ایک قطرہ کی طرح شامل ہو گئے۔ سیاہ جھنڈیوں سے فضائیں تاریک ہو رہی تھیں اور "گو بیک" کے نعروں سے زمین اور آسمان ہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف تو مجمع کا یہ عالم تھا۔ اور دوسری طرف پولیس کے لال پگڑی والے پیدل اور سوار مجمع کو آگے بڑھنے کی کوشش سے روکنے اور پیچھے ہٹانے کی جدوجہد میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ بہرحال اسی مواج سمندر میں ہم بھی تھپیڑے کھا رہے تھے۔ کہ ایک دم سے خدا جانے کمیشن آ گیا یا قیامت آ گئی۔ لیکن ایک کھلبلی سی پڑ گئی۔ پولیس والے مجمع پر جھپٹے اور مجمع سے بہت سے لوگ ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ اس طوفان کی وجہ دریافت کرنے کا کسے ہوش تھا۔ ہم بھی بلا وجہ سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ مگر بھاگتے کدھر ہر طرف تو انسان ہی انسان تھے جو بھاگنے تک کی جگہ نہ دیتے تھے۔ بہرحال کسی پر گرے کسی کو اپنے اوپر گرایا اور کسی نہ کسی طرح مجمع سے نکل جانے کی کوشش کرنے لگے

اور ایک حد تک بدحواسی کے ساتھ کوشش کرنے لگے۔ لیکن ادھر سے پنڈت جواہر لال جی ہنوز ڈٹے رہنے پر زور دے رہے تھے اور بہت سے بھاگنے والے اس نازک وقت میں بھی ان کی آواز سننے کا ہوش رکھتے تھے لیکن ہم نے تو طے کر لیا تھا کہ کوئی بھی کچھ کہے مگر بندہ اب یہاں ٹکنے والا نہیں ہے۔ لیکن جناب قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔ چنانچہ ہم بھاگ ہی رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے ایک ڈنڈا ہمارے رسید کیا۔ جو ہمارے بھاگتے ہوئے پیروں میں سے ایک پر پڑا۔ اور سچ پوچھئے تو خدا نے بڑا فضل کیا۔ کہ ہم بال بال بچ گئے۔ اب ہم ایک درخت کے قریب بیٹھ کر ذرا پیر سہلا رہے تھے کہ ایک گھوڑے سوار لال پگڑی والے نے کچھ ہماری شان میں گستاخانہ الفاظ کہنے کے بعد اس زور سے بلّم رسید کیا کہ ہم نے آنکھیں بند کر کے فوراً کلمہ پڑھ لیا اور اپنے شہید ہو جانے کا یقین کر لینے کے بعد مطمئن ہو گئے۔ لیکن آنکھ کھولنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بلّم درخت پر اس طرح سے پڑا تھا کہ ہم صاف بچ گئے تھے۔ لیکن جناب اس حادثہ کے بعد جو ہم بھاگے ہیں تو پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور دفتر میں آ کر دم لیا۔ غالباً" ہمارے پٹنے کا یہ واقعہ تو قومی نقطۂ نظر سے بجائے باعثِ شرم ہونے کے ہمارے لئے باعثِ فخر ہے۔ بلکہ اگر درخت کے حائل نہ ہو جانے سے وہ بلّم ہم پر پڑتا تو آج ہم کو بھی وہی درجہ حاصل ہوتا جو لاجپت رائے آنجہانی کو حاصل ہے۔ لیکن اس کے بعد کے

واقعات قومی اور غیر قومی ہر نقطۂ نظر سے شرافت پر پانی پھیر دینے والے ہیں مگر مجبوری ہے کہ کیا کیا جائے، لہٰذا اس لئے اور ہماری نجابت کی داد دیجئے۔

ایک مرتبہ ہمارے ایک دوست سے اسی قسم کے معاصرانہ تبادلہ کی نوبت آگئی۔ ان دوست کا نام بتاتے ہیں ذرا ہماری توہین ہوتی ہے بہرحال خود واقعہ ہی کچھ کم نہیں ہے اور مطلب تو صرف یہ بیان کر دینے سے ہے کہ ہم کیونکر پٹے، قصہ اصل میں یہ تھا کہ ہمارے وہ کرم فرما ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو کر بہت سے ایسے واقعات دہرانا شروع کر دیتے تھے جو ہماری دکھتی ہوئی رگ والے واقعات ہوتے تھے۔ لیکن اس بندۂ خدا کو نہ معلوم اس میں کیا لطف آتا تھا کہ لڑائی تو ہوئی آم کے سلسلہ میں اور دکھڑا رونا شروع کیا انہوں نے املی کا۔ چنانچہ جس واقعہ کا ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں وہ بھی اسی طرح رونما ہوا کہ وہ اپنے چند دوستوں کے سامنے قابلیت بگھار رہے تھے کہ ہم بھی جا پہنچے اور لگے ان کی قابلیت کا بھانڈا پھوڑنے اس وقت تو خیر وہ اسی طرح خاموش رہے کہ چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا لیکن جب ان کے دوست اٹھ کر چلے گئے۔ تو انہوں نے اپنی برہمی کا اظہار شروع کر دیا۔ اور ہمارے اس سوال پر کہ کیوں چپ ہو؟" وہ برس پڑے کہ ——

"میں آپ سے ملنا پسند نہیں کرتا اور اگر آپ کی سنجیدگی کا یہی

حال ہے کہ آپ کو آئے گئے لوگوں کا بھی خیال نہیں تو آپ مہربانی فرما مجھ کو معاف رکھیں۔ خود آپ کی تو کوئی پوزیشن ہے ہی نہیں لیکن آپ کو دوسرے کی پوزیشن کا بھی خیال نہیں ہے۔ تو جناب میں باز آیا"

اب بتائیے ان حضرت کے یہ الفاظ کس قدر مشتعل کرنے والے تھے لیکن غلطی خود ہماری تھی لہذا ہم نے انتہائی ضبط سے کام لے کر کہا۔

"جناب والا مجھ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ کی طبع نازک کو میرا مذاق اس قدر گراں گزرے گا۔ اگر آپ نہیں ملنا چاہتے تو بسم اللہ۔"

وہ آپ نے آج ہی یہ کوئی نئی بات نہیں کی ہے بلکہ اب تو یہ آپ کی عادت ہوئی جاتی ہے۔ اور اگر یہی حال ہے تو انشاءاللہ میں کیا کوئی بھی منہ لگانا پسند نہ کرے گا۔"

میں۔ بندہ نواز معاف فرمائیے گا آپ کی طرح کوئی خود دماغ نہیں ہے۔ رہ گئے آپ تو میں نے خود کان پکڑے کہ اب کبھی نہ ملوں گا۔

وہ۔ اب آپ کہلاتے ہیں تو۔ سنیے کہ آپ کے تمام دوست جن سے ذرا بھی سنجیدگی چھو گئی ہے آپ سے نالاں ہیں۔ اور کوئی آپ سے نالاں ہیں اور کوئی آپ سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ اور واقعی ہی اس لونڈپن کو کوئی کہاں تک برداشت کرے۔

میں۔ میرا لونڈپن آپ کی خود دماغی سے پھر بھی اچھا ہے۔ اور معلوم نہیں آپ کو کس بات پر اتنا ناز ہے۔ اگر کچھ ہوتے تو خدا جانے کیا کرتے کچھ

نہ ہونے پر تو یہ حال ہے۔

وہ۔ میں اس قسم کی بدتمیزی کی گفتگو سننا نہیں چاہتا۔

میں۔ میں آپ کے ایسے بدتمیزوں سے گفتگو کرنا بھی نہیں چاہتا۔

وہ۔ آپ اپنی زبان روکیئے ورنہ اس گستاخی کی سزا کو پہونچیے گا۔

میں۔ اپنے حواس میں رہو حد سے نہ بڑھو ورنہ یہ تمام اکڑ دھری کی دھری رہ جائے گی۔

وہ گلا پھاڑ کر: خاموش ــــ بدتمیز کہیں کا۔

ہم (گلا پھاڑ کر) چپ بیہودہ ــــ بدتمیز کہیں کے۔

تم خود بدتمیز ــــ

اس کے بعد پہلے وہ کرسی سے کھڑے ہوئے اور اس کے بعد سب سے پہلے تو بیچ میں رکھا ہوا حقہ گرا اس کے بعد ہم اور وہ گتھم گتھا ہو گئے۔ ہم کو یہ معلوم تھا کہ ہم کمزور ہیں دبلے پتلے ہیں اور وہ ہاتھ پیر کے اچھے تھے لیکن غصہ اور اشتعال اور غصہ یہ سوچنے کا موقع نہیں دیتا۔ چنانچہ ہم نے میز سے کرسی اور کرسی سے آرام کرسی پر گرنا شروع کیا۔ لیکن ہر مرتبہ گرنے کے بعد اس جوش کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے کہ اب کی بار تو ہم نہیں یا یہ مردود نہیں لیکن سچ یہ ہے۔ کہ کمزوری مار کھانے کی نشانی ہوتی ہے۔ چنانچہ آخر میں انہوں نے ہم کو مسہری پر گرا کر ایک آدھ ایسا گھونسہ رسید کیا کہ ہم کو جوابی گھونسے کا ہوش نہیں رہا۔ اور ہم نے ان کے گھٹنے سے دبے ہوئے سینہ سے مشکل آواز نکال کر کہا۔

"یہ شرافت ہے، کمینہ پن ـــــ شہدا پن ـــــ بد معاشی۔"

اس کے بعد انہوں نے جب ہم کو چھوڑا تو ہم مقابلہ پر نہیں آئے بلکہ نہایت جوش کے ساتھ تنتناتے ہوئے ان کے کمرہ سے نکل گئے۔ لہذا اس کے واقعہ کے دو مہینے بعد تک ہم دونوں آپس میں نہیں ملے۔ لیکن یہ واقعہ آج ہمارے قلم سے نکلا ہے ورنہ اسی دن جب گھر میں سب نے پھٹے ہوئے کپڑے اور چوٹیں دیکھیں اور سبب پوچھا تو ہم نے کہہ دیا تھا کہ ایک پاگل کتا لپٹ گیا تھا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ہم گرے بھی اور اس نے ہمارے کپڑے بھی نوچے لیکن اس کا دانت کہیں نہیں لگا۔ مگر آج یہ راز کی بات ہماری زبان سے نہ سہی بہرحال ہمارے قلم سے نکل رہی ہے۔ اب چاہے ہم کو کوئی ذلیل سمجھے یا کمینہ۔

ایک مرتبہ ریل میں ہماری شامت آئی اور وہ اس طرح کہ ہم غالباً لکھنؤ سے بھوپال جا رہے تھے چنانچہ صبح کے وقت جب لکھنؤ جھانسی ایکسپریس سے اتر کر وہاں بمبئی ایکسپریس پر بیٹھے تو بڑی کشمکش تھی۔ بھیڑ بھی زیادہ تھی اور مسافر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کے اوپر ایک سوار تھا۔ لیکن ہم کو بڑی عمدہ جگہ مل گئی تھی اور ہم بڑے مزے میں سفر کر رہے تھے۔ بینا جنکشن پر گاڑی کے ٹھہرتے ہی ہماری جو کمبختی آئی تو ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے پلیٹ فارم پر آ گئے اور اس وقت تک ٹہلتے رہے جب تک گاڑی نے سیٹی نہیں دی لیکن اب جو ہم گاڑی میں آ کر دیکھتے ہیں تو ہماری جگہ پر ایک اور صاحب نہایت اطمینان سے

تشریف رکھتے تھے۔ واللہ ان کا اطمینان دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے گویا یہ جگہ ان ہی کی تھی اور ہم زبردستی یا ان کی عنایت سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہم کو دیکھتے ہی نہایت لاپرواہی سے کھڑکی کے باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ ہم سمجھے کہ شاید یہ ہوا کھانے کے لئے آ بیٹھے ہیں ابھی اٹھ جائیں گے۔ لہٰذا ہم نے مارے شرافت کے اُن سے اٹھنے کا تقاضا بھی نہیں کیا۔ اور چپ کھڑے رہے۔ لیکن وہ اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم کو کھڑے کھڑے آدھ گھنٹہ ہو گیا۔ جب ہم نے دیکھا کہ ان کا اطمینان بدستور قائم ہے۔ اور وہ جگہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے تو ہم نے ان سے عرض کیا۔

"اب اٹھئے جناب میں بیٹھوں گا۔"

انہوں نے نہایت لاپرواہی سے جواب دیا۔

"ادھر بیٹھ جاؤ۔"

ہم۔ آپ ہی نہ وہاں چلے جائیں میرا تو یہاں سامان وغیرہ رکھا ہے۔

وہ۔ سامان رکھا ہے۔ تو ہم کیا کریں؟

ہم۔ ارے بھائی یہ تو میری جگہ ہے۔

وہ۔ کیا تم نے یہ جگہ خریدی ہے جو تمہاری جگہ ہے۔

ہم۔ خریدی تو نہیں ہے مگر میں یہیں پر بیٹھا ہوا تھا۔

وہ۔ تو اب ہم بیٹھے ہیں تم وہاں بیٹھو۔

ہم ۔ یہ تو اچھی زبردستی ہے ۔

وہ ۔ زبردستی کا ہے کی ۔ کیا ہم نے ٹکٹ نہیں لیا ہے ؟

ہم ۔ یہ کون کہتا ہے کہ تم نے ٹکٹ نہیں لیا ہے ۔ مگر دوسرے کی جگہ پر تو نہ بیٹھو ۔

وہ ۔ خیر ہم تو نہیں ہٹیں گے ۔

ہم ۔ ہٹو گے کیسے نہیں ؟

وہ اچھا دیکھتے ہیں تم ہٹا لیتے ہو ۔

ہم ۔ نہیں ہٹو گے ؟

وہ ۔ نہیں ۔

ہم ۔ کیوں آفت مچاؤ گے ۔ ہم پھر کہتے ہیں ہٹ جاؤ ۔

وہ ۔ کہہ تو دیا ۔ ہم نہیں ہٹیں گے ۔

ہم ۔ تم نہیں ہٹو گے ۔

وہ ۔ ہاں نہیں ہٹیں گے ۔

اب ہم کو بڑا تاؤ آ رہا تھا اور ہم مارے غصہ کے کانپ رہے تھے ۔ اس وقت اگر بس چلتا تو اس بدتمیز کو مارتے مارتے فرش کر دیتے ۔ مگر کیا کریں سفر کا معاملہ تھا اور ہم تنہا تھے ۔ لیکن چپ ہو رہنا بھی کوئی معنی نہ رکھتا تھا ۔ ہم نے پھر کہا ۔

’’تم نہیں ہٹو گے ؟‘‘

وہ ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ نہیں ۔

اب ضبط ہمارے اختیار میں نہ تھا۔ ہم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا تو اس نے ڈھکیل دیا اور ہم سامنے والی سیٹ کے مسافروں پر گر پڑے لیکن اٹھ کر ہم نے پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنی پوری طاقت کے جھٹکا دے کر کھینچا۔ لیکن اس نے دوسرے ہاتھ سے ہمارے منہ پر تڑ سے وہ چانٹا رسید کیا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے سے

چمکنے سے جگنو کے تھا وہ سماں
ہوا پر اڑیں جیسے چنگاریاں ،

والا منظر آ گیا اور معلوم ہوا جیسے ہم سینما دیکھ رہے تھے۔ اور یہ نسیم جل جانے والا اندھیرا اور روشنی تھی۔ لیکن دو ہی تین سیکنڈ کے بعد ہم پھر اس نامعقول پر جھپٹے اور خدا کی قسم اگر دوسرے مسافر بیچ میں نہ آ جاتے تو اس بدمعاش کو مارتے مارتے الّو کر دیا ہوتا لیکن ہم کو ہمارے ہم سفروں نے ایسا گھیرا کہ ہم گالیاں تو دیتے رہے لیکن ہاتھ نہ ہلا سکے۔ بہرحال یہ واقعہ بھی خواہ کسی وجہ سے ہو۔ لیکن ہمارے مار کھا جانے کے واقعات میں سے ایک ہے۔

ان تین واقعات کے بعد باہر کا تو کوئی ایسا واقعہ یاد آتا نہیں لیکن گھر میں یہ اتفاقات ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً شادی ہی میں

پھولوں کی چھڑیوں سے پیٹے تھے۔ لیکن ہم ان واقعات پر روشنی ڈالنا خلافِ مصلحت سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ اب ایسے بھی گئے گذرے نہیں ہیں۔ وہ تو کہئے برادرم عظیم بیگ صاحب چغتائی کی مروت تھی۔ ورنہ یہی واقعات مرتے دم تک ہمارے قلم یا ہماری زبان سے نہ نکلتے۔

⁂

آسیب !

کہنے لگے — "آسیب ؟"

ہم نے عرض کیا — "جی ہاں آسیب — واللہ آسیب۔"

کہنے لگے — "ہش۔"

ہم نے عرض کیا — "آپ کو اختیار ہے۔ بہرحال ہم نے تو یہ مکان اسی لئے چھوڑا اور جان بچا کر یہاں سے بھاگے ہیں۔ آپ کو بھی اسی لئے بتا دیا ہے کہ آپ کے ساتھ بال بچے ہیں۔ بہرحال اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ مگر آپ شکائیت نہ کیجئے گا کہ پہلے سے نہیں بتایا۔"

انہوں نے بغور سن کر داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ہم کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا "آپ عجیب وہمی قسم کے آدمی ہیں۔ ورنہ کسی مرد مسلمان کو اس قسم کے خبائث سے ڈرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔"

ہم نے کہا تو پھر کیا ہے۔ آپ اگر ایسے پکے مسلمان ہیں تو بسم اللہ۔ ہم تو اس کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ کہ کوئی پڑوسی مل جائے۔ مگر عرصہ سے اس مکان میں کوئی نہیں آیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب آپ جیسا بزرگ پڑوسی ملا ہے۔ مگر اس خوشی کے ساتھ ساتھ یہ رنج بھی ہے کہ ہم سے آپکا پریشان ہونا نہ دیکھا جائیگا۔"

مولانا نے بزرگانہ تبسم کے ساتھ فرمایا "انشاءاللہ سب خیریت رہے گی۔"

قصہ یہ تھا کہ ہمارے پڑوس میں ایک مکان خالی تھا اور اس کے خالی رہنے سے ہم کو طرح طرح کے آرام تھے۔ مثلاً یہ کہ کوئی مہمان آیا تو۔ تو اسی میں ٹھہرا دیا۔ خود کبھی ضرورت ہوئی تو اسی مکان کا غسل خانہ استعمال کر لیا۔ مختصر یہ کہ ایک مکان کا کرایہ دیتے تھے اور گویا دو مکانوں پر قبضہ رکھتے تھے اس صورت میں قدرتی طور پر ہماری یہ خواہش تھی کہ یہ مکان ہمیشہ خالی رہے اور اس میں کوئی کرایہ دار آنے نہ پائے۔ چنانچہ خدا معلوم کتنے کرایہ داروں کو ہم اسی طرح اڑا چکے تھے کہ جہاں انہوں نے آسیب کا نام سنا۔ بس آیۃ الکرسی پڑھتے ہوئے بھاگے۔ مگر یہ مولانا خود ہی کچھ آسیب قسم کے واقع ہوئے تھے کہ ہمارے اس بھرّے میں نہ آئے اور ہم نے لاکھ سمجھایا لیکن وہ حضرت ہمارے پڑوسی بن ہی گئے۔

یہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ مولانا کے آجانے کے بعد ہم کو کس

قدر تکلیف ہو گئی ظاہر ہے کہ جو شخص دو مکانوں میں پھیلا ہوا ہو اس کو اگر ایک ہی مکان میں رکھا جائے تو خوش نہیں رہ سکتا۔ بہر حال مجبوری کا نام صبر ہے۔ لیکن ہم اپنی کوششوں سے اب تک غافل نہ تھے اور امید کی ایک جھلک اس بات سے پائی جاتی تھی کہ خود مولانا جو بظاہر بہت زیادہ بہادر بن رہے تھے کچھ سٹپٹائے ہوئے ضرور تھے۔ چنانچہ جب آپ مکان میں اپنی گرہستی کی باقاعدہ ترتیب فرما چکے تو باہر تشریف لائے اور اس خاکسار کو بلا کر فرمایا۔

اب میں دو ایک روز میں بچوں کو لے آؤں گا۔ اور وہ بھی آپ کے یہاں کے بچوں سے مل کر خوش ہوں گے۔

ہم نے عرض کیا "ہاں صاحب آپ کی وجہ سے بڑی آبادی ہو گئی اور ہم تو گھر کی طرف سے اب بالکل بے فکر ہو گئے ہیں۔

راز دارانہ طریقہ پر فرمایا "آپ نے آسیبی خلل کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس کا تو میں قائل نہیں ہوں۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ آخر ہوتا کیا ہے جس کو آسیبی خلل کہتے ہیں۔"

ہم نے معصومیت کے ساتھ کہا "صاحب اللہ جانے ہوتا کیا ہے بہر حال ایک مرتبہ تو خود میں نے کسی کو پہلے تو چھت پر چلتے ہوئے دیکھا پھر صحن میں کوئی ٹہلتا ہوا نظر آیا اور میں جو اس کو پکڑنے کے لئے دوڑا تو دیکھتا کیا ہوں کہ چار پائی سے بندھا پڑا ہوں۔

تشویشناک طریقہ پر آنکھیں پھاڑ کر بولے "واللہ۔"

ہم نے کہا۔ "اور سُنیے اسی مکان میں ایک اور صاحب رہتے تھے ان کو تو بہت ہی پریشان کیا گیا۔ روز ان کو سوتے میں چارپائی سے الٹ دیا جاتا تھا۔ اور ایک مرتبہ تو یہاں تک ہوا کہ ان کا سر نابدان میں ٹھونس دیا گیا تھا اس کے بعد سے وہ بخار میں ایسے مبتلا ہو گئے کہ پھر جان بر نہ ہو سکے۔"

مولانا نے گڑبڑا کر کہا — "یعنی مر گئے؟"

میں نے کہا — "جی ہاں پھر وہ بچ نہ سکے۔" (یہ قصّہ کچھ سچا بھی تھا اس لئے کہ ایک صاحب کا اسی مکان میں انتقال ہوا تھا جو پانچ سال سے دق میں مبتلا تھے)۔

مولانا نے فرمایا "یہ تو جناب بڑی مصیبت ہے۔ فرض کر لیجئے کہ۔"
اندر سے کچھ کھٹکا سا محسوس ہوا۔ غالباً بلّی نے کوئی پتیلی کھولی ہوگی بعد مولانا سہم کر ہماری آغوش میں آگرے ہم نے ان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "یہ کوئی بلی وغیرہ معلوم ہوتی ہے یا شاید وہی ہو۔"

مولانا نے کوئی جواب نہ دیا۔ ان کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے اور ہم بھی مصلحتاً اسی لئے خاموش رہے کہ یہ گویا ہماری تائیدِ غیبی تھی تھوڑی دیر تک عالم سکوت میں رہنے کے بعد مولانا نے چپکے سے کہا۔
"اگر آپ مہربانی فرما کر آج رات کو میرے ہی مکان میں سوئیں تو ذرا اطمینان رہے گا۔"

ہم نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "مجھ کو آپ معاف فرمائیں۔

البتہ آپ خود میرے یہاں آرام فرما سکتے ہیں۔"

بہر حال اس رات کو مولانا نے غریب خانہ پر آرام فرمایا اور ٹھیک اس وقت جبکہ مولانا خواب شیریں میں غافل تھے اور زوردار خراٹے لے رہے تھے۔ ہم اس کام میں مصروف تھے کہ ان کے گھر جا کر تمام چارپائیوں کو اوندھا کر دیا۔ کرسیاں الٹ کر رکھ دیں، تخت الٹ دیئے۔ گھڑے اور صراحیاں اوندھا دیں، تمام بکس اور پیٹیاں الٹ کر رکھ دیں۔ مختصر یہ کہ جو چیز بھی نظر آئی اس کو قلابازی کھلا دی اور ایک گھنٹہ کی جدوجہد کے بعد آ کر سو رہے۔

صبح کے وقت معلوم نہیں اس منظر سے مولانا نے کیا اثر لیا۔ بہر حال ہم جب سو کر اٹھے تو مولانا اپنے دروازے پر کھڑے ہوئے ملے، چہرہ اترا ہوا تھا اور جسم کا خون خشک تھا۔

ہم نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟"

کہنے لگے۔ "جی ہاں، یہی خیریت سمجھئے کہ رات کو اس گھر میں نہیں سویا ورنہ خدا جانے کیا ہوتا ذرا چل کر دیکھئے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسی جن نے رات کو اس گھر کے زمین و آسمان کو بدل دیا ہے۔ اگر یہ صورت ہے تو صاحب میں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا۔"

ہم نے ان کے ہمراہ گھر میں جا کر ہر چیز کو بجنسہ ویسا ہی پایا جیسا کہ ہم نے رکھا تھا، مولانا کہتے جاتے تھے کہ "دیکھئے یہ گھڑا بھی اوندھا ہے اور یہ دیکھئے یہ میز بھی الٹی پڑی ہے۔" اور ہم گویا نقش حیرت بنے ہوئے تھے۔

آخر میں ہم نے مولانا سے کہا

"آپ آج اس مکان میں دھونی دیجئے اور میں آپ کو پڑھی ہوئی کیلیں دیتا ہوں۔ وہ ہر گوشہ میں لگا دیجئے۔ انشاءاللہ کچھ نہ ہوگا"

اب مولانا کی رگ مولویت پھڑکی اور فوراً انہوں نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا "اجی استغفراللہ میں یہ ٹوٹکے نہیں کرتا ان سب کا علاج کلام پاک میں موجود ہے میں آج ہی سب بندوبست کئے دیتا ہوں"

مولانا کو کیا معلوم تھا کہ ہمارے قسم کے آسیب کا علاج کلام پاک میں نہیں ہے۔ بہرحال وہ اپنی ایمانی مضبوطی کے ساتھ تمام دن نمازیں وغیرہ پڑھتے رہے اور شام ہی سے تمام گھر کو چراغوں سے جگمگا دیا۔ البتہ رات کو یہ ضرور کیا کہ زبردستی ہمارا بستر بھی اپنی ہی طرف اٹھا لے گئے اور سونے سے قبل کلام پاک سرہانے رکھ کر اطمینان کر لیا۔ اور جان پر کھیل کر سو گئے۔ واللہ قائل ہونا پڑتا ہے۔ ایک مسلمان کی اس ایمانی طاقت کا جو روحانی طور پر اس کو حاصل ہوتی ہے ورنہ اس قسم کے موقعوں پر کوئی اور ہوتا تو گزشتہ رات کے واقعہ کے بعد بھلا اس مکان میں سو سکتا ہے۔ مگر ہمارے مولانا اس طرح سو رہے تھے کہ گویا گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ہم نے ان کے سرہانے سے کلام پاک اٹھا کر طاق پر رکھا اس وقت بھی ان کو خبر نہ ہوئی اور جب ہم نے ان کو چارپائی سے باندھا ہے۔ اس وقت بھی وہ سوتے ہی رہے یہاں تک کہ لالٹین گل کرنے کا بھی ان کو پتہ نہ چلا۔ مولانا کو باندھنے کے بعد ہم نے خود

اپنی چارپائی میں خود اپنے کو بھی باندھ لیا اور سو گئے۔

کوئی رات کے دو تین بجے ہوں گے کہ مولانا کی نہایت آہستہ مگر بھرّائی ہوئی آواز ہمارے کانوں میں آئی۔ اب جو ہم نے گردن اٹھائی تو مولانا نے چپکے سے فرمایا۔ "ہم کو کولھو میں بندھا پڑا ہوں۔"

ہم نے بھی ترکی بہ ترکی اسی طرح خوفزدہ آواز میں کہا۔ "مجھ کو بھی باندھ دیا ہے خدا کے لئے ہم کو کھولئے۔"

مولانا نے خوف کے مارے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "ارے بھائی چپکے چپکے بولو میں بندھا بھی ہوں اور اختلاج بھی شدت سے ہو رہا ہے۔"

میں نے تعمیل حکم میں آہستہ سے کہا۔ "مجھ کو بہت زور سے پیشاب محسوس ہو رہا ہے۔ اب کیا کروں؟"

مولانا نے اپنے جسم کو چپکے چپکے جنبش دی لیکن قسمت تو دیکھئے کہ عین اسی وقت چارپائی چرچرا اٹھی اور مولانا اس آواز پر اٹینشن ہو کر اس طرح لیٹ رہے کہ سانس بھی روک لی۔ تھوڑی دیر تک جب وہ چپ پڑے رہے تو ہم نے خود ہی کہا۔ "ارے یہ رسی تو رینگ رہی ہے۔"

یہ سننا تھا کہ مولانا کا اور بھی انتقال ہو گیا اور انہوں نے گھبرا کر کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور ہم نے بھی ڈاکٹر اقبال کا شکوہ اس طرح گنگنانا شروع کیا گویا رو رو کر اپنے گناہوں سے توبہ کر رہے ہیں۔ اب یہ حال تھا کہ جہاں کسی چوہے وغیرہ نے کھٹ سے

بھی کیا۔ مولانا کا وظیفہ سول سروس کپ کی ریس کی طرح تیز ہو جاتا تھا۔ اور اس کے بعد پھر یہ جوش نارمل ہو کر رہ جاتا تھا۔ بہرحال اب تو وہ بے چارے مارے ڈر کے جنبش کرنا تو درکنار رسّی کو بھی نہیں چھو سکتے تھے کہ مبادا وہ بقول ہمارے رینگنے نہ لگے۔ اِدھر ہم کو نیند آنے لگی تھی اور جماہیوں کے مارے ناک میں دم تھا۔ لیکن ہم ہمیشہ کے آرام کے لئے ایک رات کی نیند خراب کر کے تکلیف اٹھا سکتے تھے اور ہم کو یقین تھا کہ اس ایثار اور اس قربانی کا پھل ہم کو ضرور ملے گا۔ بہرحال اسی عالم میں ہم نے رات گزار دی اور ٹھیک اس وقت جب گھڑیال نے پانچ کا گھنٹہ بجایا ہے ہم نے جماہی لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا اور مولانا کے بھی جان میں جان آئی۔ اب روشنی رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب رات کی خوفناک سیاہی پھیکی ہو گئی اور ہم مولانا کو اور مولانا ہم کو آسانی کے ساتھ دیکھنے کے قابل ہو گئے تو ہم نے دیکھا کہ واقعی مولانا بیچارے اتنی ہی دیر میں اس قدر گھل گئے تھے کہ گویا چالیس دن کے شدید تپ کے بعد اٹھے ہیں ان کی اس حالت پر بے ساختہ ہمدردی پیدا ہو گئی اور دل بھر آیا۔ ہم نے اپنی رسی کسی نہ کسی طرح ڈھیلی کر دی اور خود کو اس شکنجہ سے نکال کر مولانا کو بھی کھولا اور ان کو اٹھا کر اپنی طرف لے آئے تاکہ ان کے حواس ٹھیک ہو جائیں۔ مگر مولانا کو تو جیسے چپ لگ گئی تھی وہ مبہوت بیٹھے رہے۔ ایک دہشت ان پر برس رہی تھی اور ہم بھی گویا پریشان سے تھے۔ آخر کار

جب مولانا کو چائے وغیرہ پلائی اور ان کے جسم میں تھوڑی سی گرمی پہنچنے کے بعد رات بھر کا منجمد خون حرکت میں آیا تو وہ بولے ۔

" واللہ عقل کام نہیں کرتی "

عرض کیا ۔ " کیا کہا جائے صاحب "

کہنے لگے " دیکھئے تو ذرا پہلے تو غافل سُلایا گیا پھر کلام پاک میرے سرہانے سے غائب ، روشنی گل اور مجھ کو اور آپ کو باندھ دیا گیا اور پھر آپ کہتے ہیں کہ رسی رینگ رہی تھی "

ہم نے کہا " جی ہاں جناب مجھ کو تو بالکل یہ معلوم ہوا کہ گویا میں کسی جاندار سانپ سے بندھا ہوا ہوں ۔ مجھ کو اس میں حرکت محسوس ہوئی ۔ کیا آپ کی رسی نہیں رینگی "

غور کر کے کہنے لگا " شبہ تو کچھ مجھ کو بھی ہوا تھا مگر میں نے تو رسی کو چھوا تک نہیں کہ خدا جانے کیا واردات ہو "

ہم نے سنجیدگی سے کہا " بہت اچھا کیا کہ آپ نے رسی نہ چھوئی ۔ بہر حال جناب اب میں تو اس مکان میں سو نہیں سکتا ۔ آپ جانیں اور آپ کا کام "

کہنے لگے " رخصت میں خود نہیں سو سکتا ۔ جان بچی لاکھوں پائے مگر ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر کلام پاک میرے پاس سے نہ اٹھایا جاتا تو یہ واقعہ نہیں ہو سکتا تھا ۔ ورنہ کلام پاک اٹھانے کی کیا وجہ ؟

عرض کیا: "ہاں صاحب یہ بات تو واقعی آپ نے خوب نکالی۔ یقیناً کلام پاک کی موجودگی میں یہ باتیں نہیں ہو سکتی تھیں۔"

مولانا اسی ادھیڑبن میں رہے اور ہم دفتر چلے گئے۔ معلوم نہیں دن بھر مولانا نے کیا کیا۔ بہرحال جب ہم شام کو دفتر سے واپس آئے تو یہ معلوم ہوا کہ مولانا تمام دن اپنے دولت خانہ تشریف نہیں لے گئے اور غریب خانے ہی پر رونق افروز رہے ہیں۔ ہم کو دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"بھائی صاحب، میں نے یہ طے کرلیا ہے کہ یا تو میں اپنے کو مسلمان کہنا چھوڑ دوں ورنہ میں رہوں گا اسی مکان میں، اس قسم کے بھوت پریت سے ایک سچے مسلمان کے ڈرنے کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ یا تو مسلمان نہیں ہیں ورنہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی اسلامی تعلیم کو جھوٹا سمجھتا ہے۔"

ہم نے ایک سچے مسلمان کی طرح کہا "جزاک اللہ مولانا واقعی آپ مسلمان ہیں خدا کرے ہر مسلمان ایسا ہی ایمان رکھے اور خدا مجھ کو بھی یہ ایمانی تقویت عطا کرے۔"

فخر سے بولے "لاحول ولا قوۃ۔ میں ان گیدڑ بھبکیوں سے مرعوب ہو کر مکان نہیں چھوڑ سکتا جو مجھ کو ستاتے ہیں ان ہی کو مکان چھوڑنا پڑیگا۔ میں ان بھوتوں کے لئے خود بھوت بن کر رہوں گا۔"

ہم نے کہا "مگر جناب میں آج وہاں نہیں رہوں گا خواہ اس کو

ایمانی کمزوری کہیں یا کچھ مجھ کو اس کا اعتراف ہے مگر مجبور ہوں اپنے دل سے ۔"

ذرا سنبھل کر بولے ۔" مگر جناب میری تنہائی تو ٹھیک نہیں ۔"

ہم نے کہا آپ میرے ملازم کو وہاں سُلا لیجئے گا ۔"

مولانا راضی ہو گئے اور یہاں ملازم کو پڑھانے کی ضرورت ہی نہ تھی ۔ وہ خود اس قسم کے معاملات میں گریجویٹ قسم کا انسان واقع ہوا تھا ۔ بہرحال رات کو دس بجے تک تو ہم خود مولانا کے پاس بیٹھے رہے اور جب وہ تعویز وغیرہ اپنے بازو پر باندھ کر بستر پر جانے لگے تو ہم بھی ملازم سے یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ ذرا ہوشیار سونا ۔ اور خبردار ڈرنا نہیں مولانا موجود ہی ہیں ۔"

معلوم نہیں مولانا سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے ۔ بہر صورت جب ایک بجے رات کے قریب ہم سفید کفن میں لپیٹے ہوئے ان کی چھت سے اتر کر ان کے صحن میں آئے ہیں تو ان کا منہ لحاف کے اندر داخل دفتر تھا ۔ ہم نے پہلے تو صحن ہی میں ٹہلنا شروع کیا ۔ مگر جب اس کی اطلاع مولانا کو نہ ہو سکی تو دو تین ڈھیلے اٹھا کر یکے بعد دیگرے ہم نے مولانا کی طرف روانہ کئے یہاں تک کہ مولانا گڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور پھر فوراً مردوں کی طرح چپ لیٹ گئے ۔ غالباً انہوں نے ہم کو دیکھ لیا تھا ۔ اس لئے کہ اب ان کی سانس بھی غالباً رکی ہوئی تھی ۔ ہم برابر ٹہلا کئے اور اب ہم نے ناک میں کہنا شروع کیا ۔

"میں میں تجھ کو کچاں کھاں جاؤں گا۔" سالے میں تجھ کو کچا کھا جاؤں گا۔ یہ سننا تھا کہ مولانا نے لحاف کے اندر ہی سے چیخنا شروع کیا۔ ان کی گھگھی بندھ گئی اور ان کے ساتھ ہمارے ملازم صاحب نے بھی شور مچانا شروع کر دیا۔ ادھر ہم وہاں سے غائب اور مولانا کے دروازے پر آکر ہم نے "کھولو کھولو" کہہ کر دروازہ پیٹنا شروع کیا اور آخر کنڈی توڑ کر گھر میں آگئے ورنہ مولانا کا شاید انتقال ہی ہو جاتا۔ ہم نے جب پندرہ منٹ تک مولانا کو تسلی دی ہے، پانی کے چھینٹے دیئے ہیں تب جاکر ان کو ہوش آیا اور ان کا دل ٹھہرا۔ دوسرے دن صبح ان کو شدید بخار تھا۔ اور اسی بخار کی حالت میں وہ اپنا سامان دوسرے مکان میں منتقل کر رہے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ مکان اب سولہ آنے ہمارے قبضہ میں ہے اور اس واقعہ کے بعد سے تو ہم کو کسی سے اس مکان کے متعلق کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اس لئے کہ کوئی کرایہ دار آتا ہی نہیں۔

⁂

"ایک ملازم کی ضرورت ہے"

جی ہاں ۔ ایک ملازم کی ضرورت ہے۔ جس کے لیے پہلے تو بہت سی شرطیں تھیں کہ ذرا معقول قسم کا کھانا پکانا جانتا ہو ۔ ایماندار ہو۔ صاف ستھری عادتیں ہوں ۔ اس کی زبان دراز نہ ہو۔ کسی نشہ کا عادی نہ ہو سزا یافتہ نہ ہو۔ خوب صورت نہ سہی مگر بے حد بدصورت نہ ہو، عمر ایسی نہ ہو کہ پرورش کا بار بھی ہم پر پڑے اور نہ ایسی کہ تجہیز و تکفین کے اخراجات بھی ہمارے ہی سر آئیں۔ کسی متعدی مرض میں مبتلا نہ ہو علی الحساب صاحب اولاد نہ ہو وغیرہ وغیرہ مگر اب انداز زمانہ سے صرف ایک شرط باقی رہ گئی ہے۔ کہ وہ محض طوطا چشم نہ ہو۔ باقی سب کچھ منظور ہے۔ یعنی اس کا مہینا جو ہونا تو منظور ہے مگر وہ مستقلاً ہجرت کا عادی نہ ہو گیا ہو۔ اُٹھاؤ چولھا نہ ہو۔

بات یہ ہے صاحب ناک میں دم ہو گیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد سے کچھ ایسا قحط الرجال کا عالم ہے کہ ایک بھی ڈھنگ کا ملازم کم سے کم ہم کو نصیب نہیں ہوا۔ ہر دوسرے تیسرے دن ایک نیا ملازم اپنے نئے حالات کے ساتھ ہمارے لئے نت نئی مصیبتیں لے کر نازل ہو جاتا ہے۔ اور عین اس وقت جبکہ ہم ہر طرح کی نفس کشی کے بعد اپنے کو اس کوتاہیوں کا خوگر بنا چکتے ہیں وہ داغ مفارقت دے کر ادھر ایک آدھ برتن کچھ کپڑے تھوڑے سے روپے وغیرہ لیکر غائب ہو جاتا ہے یہ سچ ہے کہ ان چیزوں کے جانے سے نہ ہم لٹ جاتے ہیں۔ نہ یہ کوئی ایسا نقصان ہے جس کی تلافی نہ ہو سکے۔ مگر یہی کیا کم ہے کہ ہماری نظروں میں جنس وفا کی اب کوئی قیمت باقی نہیں رہی ہے۔ اور ہماری قوت فیصلہ جواب دے چکی کہ اب اس دنیا میں کس کو باوفا سمجھیں اور کس کو بے وفا۔

ایک سے ایک پیکر وفا اور مظہر صدق و صفا تشریف لائے ہیں۔ جن میں سے بعض آنکھوں میں تو نور کی جگہ بھی مروت ہی چمکتی ہوئی نظر آتی ہے وفاداریوں کا اظہار وہ زبان سے کرتے ہیں۔ باقی اپنے چہرے سے ٹپکاتے ہیں۔ آنکھوں سے برساتے ہیں اور آخر کار اس کے قائل کر دیتے ہیں کہ اس گئی گزری حالت میں بھی یہ دنیا اب ایسی بھی وفا سے خالی نہیں ہے چنانچہ قیام پاکستان کے بعد سے تقریباً یہی ہو رہا ہے۔ کہ ہمارے ملازموں کی دنیا آئی جائی بنی ہوئی ہے۔ اور فراست امید کے ایک ماہر نے ہاتھ دیکھ کر اب تو یہ بھی بتا دیا ہے کہ بابا تیری قسمت میں ملازم نہیں ہے۔

اس لئے کہ ہاتھ میں سب کی لکیریں ہیں۔ ملازم کی لکیر ایک سرے سے ہے ہی نہیں۔

قیام پاکستان کے بعد سے یہ صورت اس لئے پیش آرہی ہے کہ تقسیم ہند تک ہمارے پاس جو بزرگ محترم تھے وہ اس تقسیم کے بعد ہم سے اس طرح بچھڑ گئے گویا باؤنڈری کمیشن نے ہمارے اور ان کے درمیان ایک خط کھینچ کر ان کو ہم سے چھین کر ہندوستان کو بخش دیا اور ہم کو مجبور کیا گیا کہ ہم نئے ملازم کی جستجو شروع کریں۔ مگر اس سلسلہ میں زیادہ پریشان نہ ہونا پڑا۔ تیسرے ہی دن عین اس وقت جب ہم ہوٹل کا کھانا کھانے کے بعد نمک کے پانی سے غرغرے کر رہے تھے تاکہ بازاری کھانے کی حدّت حلق کو کوئی مستقل نقصان نہ پہنچائے ہم کو یہ مژدہ جانفزا سنایا گیا کہ ملازمت کا امیدوار آیا ہے۔ حالانکہ وہ نہیں بلکہ اس کے امیدوار ہم خود تھے۔ ہم دیدہ و دل فرش راہ کرتے ہوئے باہر آئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک عجیب الخلقت درویش صورت بزرگ کھڑے ہوئے بیڑی پی رہے ہیں اور دوسری جلی ہوئی بیڑی ان کے کان میں لگی ہوئی ہے۔ اس بدتمیزی کے ساتھ بیڑی پینا ہم کیونکر برداشت کر سکتے تھے ڈانٹنے ہی والے تھے کہ دل نے کہا:

توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

لہٰذا نہایت ادب سے خود ان کو سلام کر کے دریافت کیا۔ "کیوں بھئی نوکری کرو گے؟"

جواب کا استغنیٰ ملاحظہ ہو:- "مل جائے تو کریں گے" ورنہ گویا گھر کے رئیس تو ہیں ہی۔

عرض کیا:- "کھانا پکانا جانتے ہو؟"

جواب ملا:- "جانتے کیوں نہیں ہیں؟"

عرض کیا:- "اکیلے ہو یا بال بچے بھی ہیں؟"

فرمایا:- "ہاں کچھ بال بچے بھی ہیں مگر یہاں میں اکیلا ہی ہوں۔ تنخواہ کیا ملے گی؟"

عرض کیا:- "بھئی تنخواہ کا فیصلہ تو تمہارا کام دیکھ کر ہو سکتا ہے۔ تم آج کھانا پکا کر دکھاؤ اس کے بعد ہم تمہارا اندازہ کر سکیں گے۔"

وہ راضی ہو گئے اور ان کو باورچی خانے کا چارج دے کر سمجھا دیا گیا۔ کہ اس وقت کھانے میں یہ چیزیں تیار کرنا ہیں جو کچھ بھی سامان وہ طلب کرتے رہے ان کو ملتا رہا۔ اور ہم سب خدا کا شکر ادا کرتے رہے کہ ملازم کے سلسلے میں جن پریشانیوں کا اندازہ تھا کم سے کم ہم کو ان سے دوچار ہونا نہیں پڑا۔ اور شکر ہے خداوند تعالےٰ کا کہ اس نے اپنے خزانۂ غیب سے ہم کو ایک ملازم عطا کر ہی دیا۔ آج معلوم یہ ہو رہا تھا۔ گویا ہم سے بڑھ کر خوش قسمت کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ مسلسل یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کس کا منہ دیکھ کے اُٹھے تھے۔ خدا کی دین کا موسیٰ سے احوال پوچھنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ خود ہی قائل ہو رہے تھے کہ وہ چھپر پھاڑ کر ملازم دیتا ہے۔ اگر کوئی ملازم کے متعلق ذرا بھی اس کی شان سے

گرمی ہوئی کوئی بات کرتا تھا تو اس کی جان کو آجاتے تھے۔ بھابی جان نے باورچی خانے کا چکر لگا کر کہا " باورچی تو یہ خاک بھی نہیں ہے صورت سے تو چڑیمار نظر آتا ہے۔"

ہم نے جل کر کہا " مصیبت تو یہ ہے کہ آپ کے یہاں باورچی بھی وہی ہو سکتا ہے جو حسن کے مقابلہ میں انعام پا چکا ہو "

بیگم صاحبہ نے کہا " مجھے تو اس کی سرخ سرخ آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔"

ہم نے کہا " سرخ آنکھوں سے ڈر لگتا ہے کاش تم کو معلوم ہوتا کہ آنکھوں کی سرخی بھی ایک حسن ہے ۔

گلابی ان آنکھوں میں سرخی کے ڈورے
مئے آتشیں رنگ کے دو کٹورے

آپا نے کہا " چاہئے تھا کہ پہلے اس کو غسل کرا کے کپڑے بدلوا دیتے پھر کھانا پکواتے۔ کس قدر گندہ ہے کمبخت۔

ہم نے ڈر کر کہا۔ " خدا کے لئے اتنے زور سے کمبخت نہ کہئے۔ اگر سن لیا اس نے تو دل شکنی ہوگی۔

کھانے کے وقت تک اس کے پکائے ہوئے لذیذ کھانوں کے تصور سے معدے کو مشتعل کرتے رہے اور کھانے کے وقت سارا گھر ایک ہی دستر خوان پر جمع ہو گیا۔ دستر خوان سجایا گیا۔ سب سے پہلے ہم نے قورمہ نکالا۔ اس قورمے کی سب سے بڑی خصوصیت تو باورچی نے یہ رکھی تھی

کہ وہ صورت سے قورمہ نظر نہ آتا تھا۔ آپ نے شاہی دسترخوانوں کا حال پڑھا ہوگا کہ شاہی باورچی کھانا پکانے سے زیادہ کرتب دکھاتے تھے اور گویا پہیلیاں بجھاتے تھے۔ مثلاً آصف الدولہ بہادر کے باورچی نے ان کو اپنے سمدھی کے سامنے محض اس لئے شرمندہ کر دیا تھا کہ سمدھی صاحب قورمے کو مربّہ سمجھ کر کھا گئے تھے۔ اس لئے کہ وہ مربّے ہی کی صورت کا تھا۔ غالباً یہی آرٹ ہمارے اس باورچی نے اس قورمے میں صرف کیا تھا کہ وہ قورمے کے بجائے ہُوبہو رساول نظر آرہا تھا۔

بھابی نے اس کو دیکھتے ہی پوچھا۔ "یہ کیا چیز ہے خالہ اماں؟"

بڑے فخر سے خالہ اماں نے فرمایا۔ "کاری بیگم صاحب۔"

ہم نے اپنے دل میں سوچنا شروع کیا کہ یا الٰہی یہ کونسی کاری ہے کاریگری کے تو خیر ہم قائل ہی ہو چکے تھے مگر کاری کی تشخیص باقی تھی اور زیادہ تر خیال یہ تھا کہ یہ صورت سے کچھ ہُڈی اور کچھ چربے نظر آرہے ہیں لہٰذا ہو نہ ہو یہ السکاری ہوگی ہم ابھی اسی ادھیڑبن میں مبتلا تھے کہ آواز آئی۔ "آخ تھو۔"

بیگم صاحبہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "توبہ ہے۔ اتنا نمک تیزآب کر دیا شوربے کو بالکل۔"

اب جو ہم چکھتے ہیں تو واقعی معلوم ہوا کہ سالن میں نمک ڈالنے کے بجائے ان حضرت نے نمک کے سالن میں گوشت ڈال دیا ہے۔ خیر یہ تو ممکن ہے کہ اس بیچارے نے خود اپنے کو بیحد نمک خوار بنانے کے لئے ایسا کیا ہو۔ مگر

اس کے علاوہ جو دوسری خصوصیات تھیں ان کو ہر اناڑی سمجھ بھی نہیں سکتا۔ البتہ چونکہ ہم اس عرصے میں ایک سے ایک عمدہ کھانا کھا چکے تھے۔ لہٰذا اس قورمے کو چکھ کر تو دنگ رہ گئے۔

اس میں گوشت کا مزہ مع اپنی خوشبو کے بالکل علیحدہ تھا ــــــ مصالحے کے تمام اجزاء اپنا انفرادی رنگ اور ذائقہ رکھتے تھے۔ گھی سب سے الگ تھا اور بحیثیت مجموعی معلوم ہوتا تھا کہ قورمہ پکانے کے بعد اس کو غسل دیا گیا ہے۔ پھر وہ نہایا دھویا قورمہ ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ کباب توڑنا چاہا تو پتہ چلا کہ اب تک سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود کباب توڑنے کے لئے اوزار وضع نہیں ہو سکے۔ دوسرے پتھر کے کباب کھانے کا یہ پہلا اتفاق تھا معلوم نہیں یہ کباب کھانے کے لئے تھے یا سر پھوڑنے کے لئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ قاب میں ترازو کے باٹ رکھے ہوئے ہیں اور ان کو اٹھاتے ہی غالب کا یہ مصرعہ خود بخود یاد آجاتا تھا کہ

سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

بمشکل تمام طے کیا کہ فیرنی پر ہم اکتفا کریں ــــ مگر اس کا پہلا چمچہ سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گیا۔ معلوم ہوا کہ دھوبی کے کلف میں منہ جا پڑا ہے۔ اور منہ میں پہلے سے کوئی میٹھی چیز تھی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلیہِ راجِعُون۔

جب سارا گھر فاقے سے اٹھ گیا اور خود ہمارے محسن خانساماں صاحب

بھی کھا پی کر فارغ ہو گئے تو آپ اس کارگذاری کی روشنی میں معاملات طے کرنے کے لئے بیڑی پیتے ہوئے تشریف لائے اور سر کھجاتے ہوئے بولے :-

اچھا جی ۔ تو پھر بات ہو جائے

ہم اس عرصہ میں طے کر چکے تھے کہ اگر یہ حضرت خود ہم کو کوئی تنخواہ دیکر یہ کھانا کھلانے پر نوکر رکھنا چاہیں تو بھی ہم ان سے صرف جان کی اماں چاہیں گے ۔ مگر دیکھنا تو یہ تھا کہ خود ان کی اپنے متعلق کیا رائے ہے لہٰذا عرض کیا " ہاں بھئی ! تو شرطیں کیا ہیں تمہاری ؟ "

وہ بولے " تنخواہ تو بیس تیس روپے اور کھانے سے کم نہ لوں گا ۔ اس کے بعد میرے ہی کپڑا ویڑا رہ جاتا ہے وہ تو دیدیا کیجئے گا اور بیڑی کے دو بنڈل روز کے ۔ نائی اور دھوبی کا خرچ تو مالکوں کے سر ہوتا ہی ہے ۔ اور شرطیں کیا ہونگی "

عرض کیا " رہیں گے کہاں جناب اور کچھ بستر وغیرہ ہے یا نہیں ؟ "

بڑے توکّل کے ساتھ فرمایا " رہنے کو کیا ہے یہیں رہ جائیں گے اور بستر تو آپ کو دینا ہی پڑے گا ۔ "

اب ہم نے نہایت ادب سے اُن کو سمجھا دیا کہ بندہ نواز اوّل تو آپ کا انسان ہونا ہی مشکوک ہے ۔ خدا جانے آپ کن جانوروں میں اب تک رہے ہیں ۔ دوسرے باورچی تو آپ ایک سرے سے ہیں ہی نہیں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر آپ انسانیت کے جامے میں رہ سکیں تو آپ

کو تمام کاج کے لئے رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً گھر کی صفائی، جوتوں پر پالش کرنا۔ بچوں کو اسکول پہونچا دینا بازار کی ضرورت کی چیزیں لا دینا وغیرہ اور اس کی تنخواہ آپ کو فی الحال بیس روپے مل سکے گی۔ حادثہ یہ ہوا کہ وہ راضی ہو گئے اور رہنے لگے گھر میں۔ دوسرے دن ان کو حجامت اور غسل وغیرہ کے ذریعہ اندر حال کیا گیا اور اب وہ تین چار گز کے فاصلے سے کچھ انسان نظر آنے لگے۔ مگر تھے وہ مبارک قدم اسلئے کہ دوسرے ہی دن باورچی آگیا۔

غالباً چوتھا یا پانچواں دن تھا کہ ایک بائیسکل جو ملازموں کے لئے رہتی تھی دس روپے کا ایک نوٹ جس میں سے ان کو چائے کا ڈبہ لانا تھا ایک کمبل جو وہ اوڑھے ہوئے تھے لیکر جو غائب ہوئے ہیں۔ تو آج آتے ہیں۔ پولیس میں رپورٹ تو لکھوا دی ہے مگر پولیس والوں کے پاس ایک یہی کام تو ہے نہیں کہ ان کی ہجر سے بیقرار ہو کر ان کی جستجو شروع کر دیں۔ ان کے جانے کے بعد سے باورچی صاحب نے بھی رنگ بدلنا شروع کر دیئے۔

اس رنگ بدلنے پر یاد آیا کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ شاید اتنا رنگ نہیں بدلتا جتنا یہ ملازم ملازم کے دیکھ کر بدلتے ہیں۔ اب ان خانساماں صاحب نے غالباً اس بات پر غور کیا ہوگا کہ اس ناکارہ ملازم کو حسنِ خدمات کا یہ بدلہ مل سکتا ہے۔ کہ وہ ایک سائیکل دس روپے اور ایک کمبل لیکر غائب ہو جائے تو میرا حق یقیناً اس

سے کہیں زیادہ ہے یا غالباً یہ خیال آیا کہ اب تو لے دے کر میں ہی اکلوتا ملازم رہ گیا ہوں۔ اور یہ بابا لوگ کے والدین آقا لوگ اس بات پر مجبور ہیں کہ میری ناز برداریاں کریں۔ لہٰذا اسی شام کو ان حضرت کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اختلاج کا دورہ پڑا۔ اور وہ سیدھے ہمارے پاس تشریف لائے۔ صاحب میں مجبور ہوں۔ اختلاج کا پرانا مریض ہوں اور جب دورہ پڑجاتا ہے۔ تو مجھ سے پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔

عرض کیا۔ "بھئی تم کچھ نہ کرو۔ آرام کرو۔"

کہنے لگے۔ "صرف اس سے تو کام نہیں چلے گا۔ اختلاج میں گاجر کا حلوہ مفید ہوتا ہے اور میرے مزاج کے خلاف کوئی بات بھی نہ ہو۔"

نہایت عاجزی سے عرض کیا۔ "یہ تو ٹھیک ہے مگر انصاف شرط ہے اب گاجر کا حلوہ کون بنائے۔ گاجریں کون لائے۔ رہ گئی یہ بات کہ مزاج کے خلاف کوئی بات نہ ہو اس سلسلہ میں آپ کو معلوم ہے کہ ہم ویسے ہی آپ کے چشم و ابرو کے اشاروں کے تابعدار واقع ہوئے ہیں۔"

کہنے لگے۔ "دام مل جائیں تو گاجر کا حلوہ بھی برابر کی کوٹھی کے خانساماں سے بنوا لوں گا۔"

غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ یہ برابر والی کوٹھی کا خانساماں ہمارے

کچھ سوتیلے عزیزوں میں سے ہے۔ قصور صرف اتنا ہے۔ کہ یہ حضرت پہلے ہمارے یہاں تشریف لائے تھے۔ اور چونکہ ہم نے ان کی یہ شرط منظور نہ کی تھی کہ چار مہینے کی تنخواہ پیشگی دے دیں لہٰذا وہ بس اتنی سی بات پر ایسے ناراض ہوئے کہ اب مستقل طور پر ہمارے ہر ملازم کو بھڑکاتے ہیں مگر اس وقت مقطع میں کچھ ایسی سخن گسترانہ بات آپڑی تھی کہ ہم نے چپکے سے گاجر کے حلوے کے دام خانساماں صاحب کو دیدیئے۔ حالانکہ اس کے باوجود برابر والی کوٹھی کے خانساماں نے ان حضرت کو ہمارے یہاں سے رفوچکر کر دیا اور یہ حضرت بھی وفا نہ کر سکے۔

دوسرے دن ہم اپنی محرومیٔ قسمت پر بیٹھے غور ہی کر رہے تھے کہ ایک بزرگ محترم جو غالباً کسی مدرسہ کے مُلّا یا کسی مسجد کے موذن ہوں گے۔ آئے اور "السلام علیکم" کا نعرہ بلند فرما کر ٹوٹ پڑے۔

عرض کیا۔ "وعلیکم السلام! کیسے زحمت فرمائی"

مولانا نے فرمایا۔ "سنا ہے آپ کو نوکر درکار ہے۔"

اب تو اور بھی حیرت ہوئی کہ اب تک تو خواجہ خضر بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھایا کرتے تھے۔ اور اب یہ ملازم بھی دلوانے لگے ہم نے اپنے آپ کو سراپا شکر بنا کر عرض کیا۔ "جی ہاں ضرورت تو ہے۔ کیا آپ کی نظر میں کوئی ملازم ہے اور آپ تشریف تو رکھئے اس

کرسی پر۔"

مولانا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "کام کیا کرنا ہوگا؟"

عرض کیا "حضرت بس کام یہی ہے کہ کھانا پکانا جانتا ہو۔ ذرا ایماندار ہو۔"

مولانا نے ریش اقدس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ایماندار؟ ایمان اگر نہیں ہے تو مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔ میں حرام سمجھتا ہوں، بے ایمان کو۔"

عرض کیا "حضرت آپ سے کیا مطلب۔ میں تو ملازم کے متعلق کہہ رہا تھا۔"

مولانا نے فرمایا "میں خود ہی تو ملازمت کیلئے آیا ہوں۔"

ایک مرتبہ "جی" کہہ کر ہم پہلے تو اچھل پڑے پھر خیال آیا۔ کہ ایسے مقدس بزرگ کو ملازم رکھنا سوائے بے ادبی اور گستاخی کے کیا ہو سکتا ہے مگر پھر سوچا کہ ممکن ہے یہ کوئی فرشتہ رحمت ہو جو ملازم کے روپ میں آگیا ہے اور اس کے پکائے ہوئے کھانے کا قیامت میں حساب نہ دینا پڑے دیر تک سوچنے کے بعد اب یہ فکر کہ یہ حضرت کرسی پر اس ٹھاٹھ سے برابر بیٹھے ہوئے ہیں آئندہ بھی ان کی اسی قسم کے سلوک کی توقع ہوگی۔ لہذا عرض کیا "بڑے میاں بات یہ ہے کہ تمہارے انداز کچھ ملازموں کے ایسے معلوم نہیں ہوتے کہیں اور بھی کہیں نوکری کی ہے؟"

کہنے لگے "کیوں نہیں مدرسہ کاظمیہ کے دارالاقامہ میں مدت سے نوکر تھا"

پوچھا "آپ کی شرائط کیا ہیں؟"

کہنے لگے "تنخواہ اور کھانا تو بعد میں انشاء اللہ طے ہو جائیگا مگر ایک بات سُن لیجے کہ میں کھانا آپ سب کے ساتھ کھاؤں گا۔ بات یہ ہے وقت پڑ گیا ہے ورنہ میں خود اعلیٰ خاندان سے ہوں"

وہ تو ہم کرسی پر بیٹھنے کے انداز ہی سے سمجھ گئے تھے۔ مطالبہ اس کا جائز تھا۔ اسلامی مساوات کا تقاضہ بھی یہی تھا مگر اب کیا عرض کیا جائے۔ کہ ان معاملات میں ہم لوگ کس قدر مسلمان رہ گئے ہیں بہرحال سوال تو اس وقت یہ تھا کہ ان حضرت کو جواب کیا دیا جائے؟ بمشکل تمام خیال آیا کہ چلو جھوٹ ہی بول دیں۔ عرض کیا: "بھائی بات یہ ہے کہ اس وقت ایک اور ملازم آرہا ہے۔ اس سے میں وعدہ کر چکا ہوں۔ اور ایفائے عہد کا بڑا درجہ رکھا ہے۔ ہمارے اسلام نے، لہٰذا آپ کل پرسوں تک پوچھ لیجئے گا۔ اگر ضرورت ہوئی تو دیکھا جائیگا۔

وہ فرشتہ صورت بزرگ تو چلے گئے۔ مگر ان کے جاتے ہی واقعی ایک اور ملازم آگیا۔ جو صورت سے تو خیر جمعدار معلوم ہوتا تھا۔ عمر بھی خاصی تھی۔ مگر ہاتھ پیروں میں ابھی دم معلوم ہوتا تھا۔ گفتگو کی تو پتہ چلا کہ حواس خمسہ میں سے صرف دو باقی رہ گئے ہیں۔ سوجھتا بھی کم ہے سنتے بھی برائے نام ہیں اور بولتے بھی وہ زبان ہیں جس کا بس مفہوم ہی

ٹھونا جا سکتا ہے ہم نے کہا چلو کچھ نہیں سے کچھ ہے۔ بہرحال بہتر ہوتا ہے۔ تنخواہ طے کر لی۔ مزید شرائط بھی کچھ نہ تھے۔ بیچارہ بے عذر سا نظر آتا تھا۔ اور چونکہ کوشش یہ تھی کہ اب ان حضرت کا دل ہاتھوں میں رکھ کر ان کو اپنے اخلاق کا گرویدہ بنائیں گے تاکہ یہ اخلاقی زنجیروں میں جکڑ جائیں۔ لہٰذا ان کو چچا میاں کہنا شروع کر دیا۔ وہ حضرت یہ سن کر کچھ اس شفقت سے مسکرائے۔ جس کا فارسی میں ترجمہ ہوتا ہے ؎ .

ز قدر و شوکت سلطان نہ گشت چیزے کم۔
کلاہِ گوشہ دہقاں بہ آفتاب رسید

چلئے سر سے ایک بار اتر گیا۔ صورت دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ اب یہ کھا گئے اور طوطا چشم بننے والا آدمی نہیں ہے۔ بیچارہ پڑا رہے گا گھر میں سب کو منع کر دیا کہ اس کی بزرگی کا خیال رکھا جائے اور کوئی زیادتی نہ ہو۔

دوسرے دن جو دفتر سے آئے تو گھر میں ہر ایک کے چہرہ پر ایک غماز قسم کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ آپا نے صورت دیکھتے ہی کہا۔ اب آئیگا۔ مزہ نوکر رکھنے کا۔ اور کہو چچا میاں وہ تو اب پوری خدمت کرائیں گے .

بھابی بولیں "ہم میں سے تو کسی کے بس کا روگ ہے نہیں اب یہ ہی تازہ روٹیاں پکا پکا کر کھلایا کریں گے"

ہم نے حیرت سے پوچھا "آخر کچھ معلوم تو ہو یہ معمہ کیا ہے"

بیگم صاحبہ نے ہنس کر کہا " اطمینان سے بیٹھئے تو ان بڑے میاں کی شرطیں سنائی جائیں۔

ہم نے گھبرا کر کہا " یعنی ان کی بھی کچھ شرطیں ہیں۔ آپ بتلائیے۔ میں اطمینان سے ہوں۔"

معلوم ہوا کہ بڑے میاں نے اپنے متعلق سب کو ڈائٹس دے دیا ہے کہ چونکہ میں تنفس کے مرض میں مبتلا ہوں لہذا چاول بالکل نہیں کھا سکتا۔ حالانکہ یہ بات ہم سے کہنے کی نہ تھی بلکہ راشن بندی کے حکام سے کہنے کی تھی۔ جو نصف چاول دیتے ہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ کوئی بادی چیز، کوئی کھٹی چیز کوئی مرچ کی چیز یا تیل کی چیز ہرگز نہیں کھا سکتا۔ میرے لئے آدھ پاؤ گوشت اس وقت اور آدھ پاؤ اس وقت علیحدہ پکے گا بے مرچ اور بے کھٹائی کا۔ روٹی میں کھانے کے ساتھ اس طرح کھا سکتا ہوں کہ گرم گرم اترتی جائے میں کھاتا جاؤں۔ لہذا سب کے لئے تو خیر میں پکا دوں گا اس لئے کہ نوکر جو ٹھہرا۔ مگر میرے لئے کسی اور کو یہ تکلیف کرنا پڑے گی۔ صبح کی چائے مجھ کو نہ دی جائے۔ اس کے بجائے ایک پیالی دودھ پی لیا کروں گا۔ رات کو نو بجے تک میں آپ کا ملازم ہوں۔ اس کے بعد بستر سے ہرگز نہ نکلوں گا۔ سورج نکلنے سے پہلے مجھ کو کبھی نہ اٹھایا جائے ورنہ دردِ سر ہو جاتا ہے۔

تفصیلات ختم نہ ہونے پائی تھیں کہ ہم نے بڑی زور سے پکارا۔

" چچا میاں —"

بڑے میاں نے آکر نہایت رازداری سے پوچھا: "کیا مجھ کو بلایا تھا؟"

عرض کیا: "جی ہاں دریافت یہ کرنا تھا کہ پاگل خانہ میں آپ رہ چکے ہیں کبھی یا اب جانے کا ارادہ ہے۔؟"

اور پھر جو یہ سختی ہوئی شعر ہیں ان کو سنائیں تو وہ ان پر اڑے رہے سمجھ میں نہیں آتا اب ان حضرت سے کیا کہیں اور نہ کہیں تو کیا کریں۔ ارادہ کر رہے ہیں کہ ان کو ایک پرچہ صرف یہ مصرعہ لکھ کر بھیج دیں کہ: ع

نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی۔

مگر کیا واقعی ہمارے ہاتھ میں ملازم والی ریکھا ہے ہی نہیں ایک سرے سے۔

⁂

"بیری اور ڈھیلے"

جس گھر میں بیری ہوتی ہے۔ اس میں ڈھیلے آتے ہی ہیں :-
چنانچہ یہ جواب نہایت اطمینان سے رفیقۂ حیات بنی بیٹھی ہیں اور ایک زمانہ میں نہایت شدید قسم کے بیری رہ چکی ہیں۔ جن کے لئے اس خاکسار کو بھی ڈھیلا بن کر اچھلنا پڑا تھا۔ اور وہ گھر جواب ہماری سسرال کہلاتا ہے۔ ایسے ایسے عجیب و غریب ڈھیلوں کی چاند ماری بنا ہوا تھا کہ اب کیا عرض کیا جائے۔ ہم کو بہ تفصیل اس لئے اور بھی معلوم ہے کہ علاوہ ڈھیلہ واقع ہونے کے ہم پہلے سے کچھ رشتہ دار بھی تھے اور ہمارے یہاں اس سلسلہ کا گویا ٹیلی پرنٹر لگا ہوا تھا۔ جس میں ذرا ذرا سی بات کی خبر آجایا کرتی تھی کہ آج کس کی نسبت آئی۔ اور اس کا کیا جواب دیا گیا۔

بات اصل میں یہ تھی کہ ان بیوی صاحبہ کی والدہ محترمہ جو آخرکار اس نیاز مند کی خوش دامن بن کر راہی ملک عدم ہوئیں۔ کچھ عجیب بلند حوصلہ محترمہ واقع ہوئی تھیں اور ان صاحبزادی کے متعلق تو ان کا یہ خیال تھا۔ کہ ہفت اقلیم میں ایسی لڑکی کا ہے کو کسی کے یہاں پیدا ہوئی ہوگی چندے آفتاب چندے مہتاب۔ پڑھی لکھی یعنی مڈل پاس سلیقہ شعار ایسی کہ کروشیا سے تکیہ کے غلاف کہیئے تو بارہ سنگھا بنا دے۔ کہیئے تو خرگوش بنا دے۔ سینے پرونے میں ایسی ماہر کہ رومالوں کے کونے پر ایسے ایسے پھول کاڑھ کر دکھا دے جو آج تک دنیا کے کسی چھپے میں نہ کھلے ہوں۔ کرتہ وہ سی لے جمپر کے ایک سے ایک ڈیزائن اس سے لے لیجئے۔ مختصر یہ کہ ایسی ہمہ صفت موصوف لڑکی کے لئے وہ کوئی معمولی قسم کا رشتہ تو ظاہر ہے کہ قبول کر ہی نہ سکتی تھی۔ چنانچہ پہلے ان کی شرط یہ تھی کہ لڑکا کم سے کم جج تو ہو پھر غالباً لوگوں نے ان کو سمجھایا ہوگا کہ اب آپ کی لڑکی ایسی بھی عدالت عالیہ نہیں ہے جس کے لئے شوہر کا جج ہونا ضروری ہے۔ آخر بڑی رعایت کی تو یہاں تک مان گئی تھیں کہ وہ جج نہ سہی مجرم سہی۔ مگر چھ سات سو روپیہ کا سرکاری نوکر ضرور ہو۔ گھر کی کچھ جائداد ہو سواری میں موٹر ہو۔ موٹر کا تو ایسا شوق تھا کہ کچھ دنوں تک تو وہ تمام نسبتیں مسترد ہوتی رہیں۔ جو نسبت لانے والے موٹر کے علاوہ کسی اور سواری پر آئے گویا اس امتحان میں شرکت کے لئے اوّل نمبر

کی جگہ موٹر کے ممبر کی ضرورت تھی۔ چوچلے تو یہ۔ معیار اس قدر بلند مگر نسبتیں کچھ اس طرح کی آرہی تھیں مثلاً ایک صاحب کی نسبت آئی معلوم ہوا کہ ایک ہزار روپیہ ماہوار کی مستقل جائداد ہے۔ اور اگر کوئی دنگل وغیرہ ہو گیا اور کشتی طے ہو گئی تو ہزار بارہ سو روپیہ اس کے علاوہ۔ یہ لڑکا ذرا پہلوان تھا۔ اس میں تو شک نہیں نہایت خوبصورت جوان تھا۔ اور ہم خود اپنی جگہ پر اگر اپنے کسی حریف سے گھبرائے ہیں تو وہ یہی حضرت تھے۔ اندیشہ یہ تھا کہ اگر ان کو معلوم ہو گیا کہ ہم بھی امیدواروں میں ہیں تو بغیر طے کئے کہ کشتی ہو گی خم ٹھونک کر سامنے آجائیں گے۔ حالانکہ ہمارا ان کا مقابلہ ہی کیا۔ اشتہاروں میں اس قسم کی تصویر اکثر آپ نے دیکھی ہوں گی کہ ایک سہما سوکھا سا ہڈیوں کا ڈھانچہ ایک طرف کھڑا ہے اور ایک پہلوان کا پٹھا آدمی دوسری طرف۔ اور نیچے لکھا ہوا ہے۔ دوا کھانے سے پہلے اور دوا کھانے کے بعد" تو ہم تو ازل طور پر۔ دوا کھانے سے پہلے والے واقع ہوئے تھے اور وہ تھے دوا کھانے کے بعد والی قسم کے ایک فرد۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ خوش دامن صاحبہ کی سمجھ میں خود ہی یہ بات آگئی کہ اگر یہ دیو ان کا داماد بن گیا تو کسی دن سب کا ناشتہ کر جائے گا۔ کہنے لگیں۔ نا بابا! میری لونڈیا سینک سلائی سوکھی سہمی دھان پان۔ یہ کوئی جوڑ میں جوڑ ہے۔

ہر چند کہ پہلوان صاحب اس صاف جواب کے بعد بھی کوشش

کرتے رہے کہ میں کشتی لڑنا چھوڑے دیتا ہوں۔ ورزش بھی نہ کروں گا۔ اگر نسبت طے ہوگئی تو فاقے کرکے آدمی بننے کی کوشش کروں گا۔ مگر خوشدامن صاحبہ نے ایک نہ سُنی :۔

ایک اور نسبت جس نے ہم کو سب سے زیادہ کوفت میں مُبتلا کر رکھا تھا ایک نواب صاحب کے یہاں سے آئی تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ ان حضرت کے یہاں موٹر بھی ایک سے ایک بڑھیا موجود تھی۔ آمدنی کا سوال ہی نہیں۔ جبکہ خرچ ہزاروں روپیہ ماہوار کا تھا۔ کچھ خطاب یافتہ بھی تھے۔ اس کے لئے بھی تیار کہ لڑکی کے نام جتنی کہیے جائداد بھی لکھ دیں پھر جتنا کہیے باندھ لیں۔ البتہ عیب صرف ایک تھا کہ عمر ذرا زیادہ تھی۔ یہی کوئی پچاس پچپن کے لگ بھگ یعنی جسم سے کافور کی بو آنا شروع ہوگئی تھی۔ مگر اس سلسلہ میں خوشدامن صاحبہ کا نظریہ نہایت خطرناک تھا کہ بڈھا شوہر جوان بیوی کو چاہتا زیادہ ہے۔ معلوم نہیں یہ باتیں عورتیں کن کتابوں میں پڑھا کرتی ہیں۔ دوسرے وہ یہ بھی فرماتی تھیں کہ لڑکے کی عمر ہی کیا دیکھنا مثل مشہور ہے کہ ساٹھا تو پاٹھا۔ آگ ہی تو لگ جاتی تھی جب ان خواجہ خضر کو بھی مارے دُلار کے لڑکا ہی کہا جاتا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ ان بڑے میاں نے روپیہ پانی کی طرح بہانا شروع کردیا تھا۔ آج اپنے باغ کے آموں کے بہانے سے دُنیا کے ہر قسم کے آم سینکڑوں زرکار کشتیوں اور خوانوں میں لگے چلے آرہے ہیں۔ اور پھر وہ نفیس

ہو رہے ہیں محلّہ بھر میں ۔ آج اپنے مقدّمے جیتنے کی خوشی میں حلوائی کی دوکان کی دوکان ڈھلوائی ان کے گھر ۔ آج لاٹ صاحب کی دعوت تھی لہذا ایک سے ایک مُرغ مسلّم اور ایک سے ایک جہازی مچھلی آ رہی ہے ۔ خوشدامن صاحبہ ہیں کہ یہ ٹھاٹھ دیکھ کر کھلی جا رہی ہیں ان کی ہاں میں ہاں ملانے والی مغلانیاں اور پیش خدمتیں ہیں ۔ کہ نواب صاحب کا حق ادا کرنے میں ہر وقت ایک نو تصنیف قصیدہ لئے موجود ۔

اللہ رکھے ہماری بیٹی راج کرے گی راج ۔

اے سُنا ہے کہ نواب صاحب نے اپنی باغ والی کوٹھی کو سجانا شروع کر دیا ہے یہ تو ہے کہ عیش کرا دیں گے نواب صاحب ۔

اے ان کی ڈیوڑھی کا روز مرّہ کا خرچ ہزاروں روپے ہے چھو تو مرٹر ہی ہیں ۔

عمر کوئی ایسی زیادہ تو نہیں زبیدہ کے دولہا کو دیکھ لیجئے نا پچاس سے کل ہے کو کم ہوں گے مگر کیسے ہنسی خوشی رہ رہے ہیں دونوں ۔

مگر خدا جنّت نصیب کرے خسر صاحب محترم کو وہ اپنی جگہ اڑ گئے تھے کہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر میں اپنی لونڈیا کو اُس لٹولٹ ہوئی سوے کی قبر میں ہرگز دفن نہ کروں گا ۔ بات یہ تھی کہ خسر صاحب

محترم ان حضرت کو پہلے ہی سے مارے سعادت مندی کے بھائی صاحب کہا کرتے تھے اور اب وہ حضرت ان کو قبلہ کہنے پر تلے ہوئے تھے۔ ہر چند خسر صاحب محترم کے لئے زندگی میں پہلا موقع تھا۔ کہ بیوی کی کسی بات کی مخالفت کا کفر ان سے سرزد ہو رہا تھا۔ مگر معلوم یہ ہوتا تھا کہ جیسے وہ جان پر کھیل کر بیٹی کی جان بچانے کا عزم کر چکے ہیں۔ دنیا حیران تھی کہ بارگاہ زوجیت کے اس حاشیہ نشینی میں یہ جرأت رندانہ کہاں سے آگئی۔ خود بیگم صاحبہ کا یہ عالم کہ شوہر کی اس بیباکی پر حیران۔ کہ ماجرا کیا ہے مگر وہ مجاہدانہ سرفروشی کے ساتھ اپنی ضد پر قائم کہ اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے مگر یہ رشتہ میرے جیتے جی نہیں ہو سکتا۔ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

آخر خورشید امن صاحبہ نے بھی ان کو نوٹس دے دیا کہ اگر یہ رشتہ نہیں ہو سکتا تو یہ بھی کان کھول کر سن لو کہ تمہاری بہن کے پھٹیچر لڑکے کو بھی میری لڑکی نہ جائے گی۔

یہ پھٹیچر اس خاکسار کے متعلق ان محترمہ نے فرمایا تھا۔ گویا کہ

؏

"دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا"

پھٹیچر کہنا تو خیر اُن کی بزرگی تھی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ موٹر کی جگہ ہمارے پاس فی الحال بائیسکل تھی اور چونکہ بائیسکل ایک ایسی مرنجان مرنج سواری ہے جس میں ہر کالجوں کے پروفیسروں سے لے کر ڈاکخانہ کے پوسٹ مین تک

اور اخباروں کے ایڈیٹروں سے لے کر اخبار بانٹنے والے ہاکر تک سب ہی بیٹھتے ہیں۔ لہٰذا ان محترمہ کے نزدیک ظاہر ہے کہ ہم پروفیسر یا ایڈیٹر نہ ہوسکتے تھے۔ البتہ پوسٹ مین اور ہاکر قسم کے پھٹیچر ضرور ہوسکتے تھے۔ دوسرے ہماری آمدنی کے متعلق وثوق سے یہ کہا جاسکتا تھا کہ کیا ہوگی۔ اس لئے کہ ابھی تو کالج سے نکلے ہی تھے اور آج کل کسی کالج سے نکلنے والے کے متعلق مشکل ہی سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ اونٹ کس کل بیٹھے گا۔ گویا فی الحال صرف یہ طے تھا کہ یہ اونٹ ضرور ہے۔ کل کا طے ہونا باقی ہے۔

سوال یہ تھا کہ آخر ہم پر ایسی کیا مار پڑ رہی تھی کہ یہ تمام باتیں گوارا تھیں۔ اور امیدواری سے دستبردار نہ ہوتے تھے۔ اصل میں یہ ایک راز ہے مگر اب جبکہ وہ قصہ ہی ختم ہوگیا۔ راز داری آخر کس بات کی ہے۔ لہٰذا عرض ہے کہ کبھی بچپن میں ہم دونوں کے درمیان یہ معاہدہ ہوچکا تھا کہ ہم دونوں اگر زندہ رہے تو زندگی کے ساتھی ضرور بنیں گے۔ یہ وعدہ دونوں نے بڑی سنجیدگی سے کیا تھا۔ اور اس کا نقش کچھ ایسا گہرا تھا کم از کم ہمارے دل پر کہ ہم پہلوان صاحب کے حریف بن کر بھی زندہ رہے اور ان نواب صاحب کے مقابلہ کے باوجود ہماری امیدواری میں کوئی فرق نہ آیا۔ مگر اب جبکہ خورشید امین صاحبہ نے قطعی طور پر طے کر دیا تھا کہ وہ پھٹیچروں میں لڑکی نہ دیں گی اور خصوصاً اس پھٹیچر کو تو ہرگز داماد نہ بنائیں گی۔ ہمارے لئے واقعی یہ

سوال تھا کہ اب کیا کریں۔

پہلوان اور نواب صاحب تو تھے ہی۔ قسمت تو دیکھئے ایک جج صاحب کی نسبت بھی آگئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ خوشدامن صاحبہ کی گویا منہ مانگی مراد ملی۔ اور یہ بھی طے پایا کہ اب اگر ہم امید داری سے دستبردار نہ ہوئے تو آپ کو معلوم ہے کہ جج پھانسی تک دے سکتا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ ان نسبتوں کے سلسلہ میں نہ خوشدامن صاحبہ کی خوش قسمتی کام کر رہی تھی نہ اُن کی صاحبزادی کا اقبال ایسا یاور تھا بلکہ یہ سب ہماری بدبختیاں تھیں کہ ان کو ایسی ایسی لاجواب نسبتیں دھڑا دھڑ مل رہی تھیں۔ ان جج صاحب کے سلسلہ میں خوشدامن صاحبہ کی مرضی کا کوئی سوال ہی نہیں وہ تو اپنی ولایت تک کی قائل ہو چکی تھیں۔ کہ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ میری بیٹی کسی جج کو جائے گی مگر مزیداری یہ تھی کہ خسر صاحب محترم بھی تیار ہو گئے۔ چنانچہ پڑتال کی گئی۔ معلوم ہوا کہ لڑکا علاوہ جج ہونے کے نجیب الطرفین بھی ہے، خوبصورت بھی ہے سلیم الطبع بھی ہے۔ اور ایک لڑکے میں جتنی خوبیاں ہو سکتی ہیں وہ سب موجود ہیں۔ نتیجہ یہ کہ نسبت طے ہو گئی۔

لیجئے وہاں نسبت طے ہوئی اور یہاں عشقِ مجازی ایک دم عشقِ حقیقی بن گیا اور صورت کچھ ایسی ہو گئی کہ یا تو اب تک زرینہ کی طلب تھی یا اب دل سے یہ آوازیں خود بخود آنے لگیں کہ او کمبخت کیا تو ایسا خود غرض ہے کہ اپنی زرینہ کی زندگی کو خوشگوار بھی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ

تیرے پاس آکر خود بھی پھٹیچر بن جاتی ۔ مگر اب وہ ایک جج کی بیوی بنے گی۔ بنگلے میں رہے گی ۔ موٹر پر پارٹیوں میں جائے گی ۔ آواز کو لہرا لہرا کر بیرا اور خانساماں کو آواز دیا کرے گی۔ گرمیوں میں پہاڑ پر رہا کرے گی۔ مختصر یہ کہ دل کو سمجھا لیا ۔ کہ محبت اگر سچی ہے تو ہمیں اس موقع پر اس خیال سے خوش ہونا چاہیئے ۔ کہ ہماری زندگی کی شریک بننے والی اور بن کر زندگی کے عذاب میں مبتلا ہونے والی ، اس زندگی میں شریک ہو رہی ہے ۔ جس میں "زندگی کے عذاب نسبتاً" کم ہیں ۔ لہذا ہم خوش ، ہمارا خدا خوش ، اس لئے کہ عشق جو ٹھہرا ۔ اور وہ بھی صادق ۔

بلند حوصلگی ملاحظہ ہو کر شادی میں شرکت بھی کی ۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے دل کوئی نچوڑے لیتا ہے ۔ آنکھیں وہ دیکھ رہی تھیں جو دیکھا نہ جاتا تھا مگر کیا مجال جو جبیں پر ایک شکن بھی ہو ۔ بلکہ اپنی فیاضی کو اور بھی نمایاں کرنے کے لئے بارات کو کھانا کھلانے کے انتظام میں اپنے کو مصروف کر لیا تھا یہ تھوڑے معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہماری منگیتر کی شادی ہے ۔

دسترخوان پر کباب کی قاش کا زاویہ درست کر کے اٹھ ہی رہے تھے کہ خسر صاحب نے ہم کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹا اپنی طرف اور گھسیٹتے ہوئے محفل تک لے آئے ۔ عقل حیران کہ ماجرا کیا ہے ۔ دماغ سن ہو کر رہ گیا ۔ بہرحال یہ طے تھا کہ کسی نے ان کے کان بھر دیئے ہیں کچھ اور ۔ یہ

بھری محفل میں بے عزت کر کے ہم کو یہاں سے نکالنے والے ہیں۔

خسر صاحب محفل میں پہونچ کر بولے ”لڑکا میرے گھر میں موجود نہ ہو تو ایسے شرابیوں کے حوالے کر دوں اپنی لڑکی۔ مجھ کو تو خدا نے عین وقت پر بال بال بچایا“ اور ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ برخوردار مجھ کو یہ تمہاری حق تلفی کی سزا ملی۔ بہرحال جس کا حق ہے اسی کو اب مل کر رہے گا۔ جی چاہا کہ خسر صاحب کے قدموں پر گر کر ان کی بیٹی کو بیوہ کر جائیں۔ شدتِ جذبات میں۔ مگر وہ ہم کو مسند پر دھکیل چکے تھے اور خدا جانے سر پر کون صافہ لپیٹ رہا تھا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں زنانہ محفل میں خوشدامن صاحبہ ہماری بلائیں لے رہی تھیں۔

⁂

دوزخ

(دروازہ پر کوئی آہستہ سے دستک دیتا ہے)

شیخ صاحب :۔ کون ہے۔ معلوم ہے سب کو کہ آج میرا خضاب کا دن ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ میں خضاب کے دن کسی سے نہیں ملتا۔ پھر بھی دروازہ بجایا جا رہا ہے۔

ناہید :۔ (دروازے سے جھانک کر) میں آسکتی ہوں، ماموں جان۔

شیخ صاحب :۔ کون؟ ناہید! آؤ آؤ۔ میں سمجھا کہ جانے کون ہے بیٹا تم اس وقت کہاں۔

ناہید :۔ (قریب آتے ہوئے) تسلیم، امی جان کے ساتھ آئی ہوں۔

شیخ صاحب :۔ خوب خوب، کہاں ہیں فرخندہ؟ بیٹی، ذرا دیکھنا جلد پر تو سیاہی نہیں آئی خضاب کی۔ یہ بھی بڑھاپے کا ایک عذاب ہے۔

ناہید: ۔ جی نہیں بالوں ہی پر ہے ۔

شیخ صاحب: ۔ بالوں پر تو ہونا ہی چاہیے۔ تو ہیں کہاں بی فرخندہ؟ جب میں تم کو دیکھتا ہوں فرخندہ کا بچپن یاد آجاتا ہے ۔ ہو بہو ماں کی تصویر ہو ۔ وہ تمہاری عمر میں بالکل ایسی ہی تھیں ۔ اور تم ان کی عمر میں بالکل ویسی ہی ہو جاؤ گی ۔ بلاؤ نا فرخندہ کو ، ذرا ٹھہرو ، یہ آئینہ میرے چہرے کی سیدھ میں لے کر بیٹھو ، ہاں یوں ۔ مگر یہ کیا اس میں تو گھر ہی نظر آ رہا ہے ۔ ارے بھئی چہرے کی سیدھ میں رکھو ۔ ہاں یہ بس بس یوں ہی رہنا ۔

فرخندہ: ۔ (باہر سے آواز آتی ہے) ناہید!

ناہید: ۔ (اندر ہی سے) آجایئے امی جان ، ماموں جان یہاں ہیں ۔

فرخندہ: ۔ (آتے ہوئے) بھیا تسلیم ۔

شیخ صاحب: ۔ (خضاب لگاتے ہوئے بند منہ سے) جیتی رہو ہاں ہاں ہوں (صاف آواز میں) تم نہ ہلو بیٹی ۔ مونچھوں کے بجائے بھنوؤں میں لگ گیا ہوتا ابھی خضاب ۔ بس ایک منٹ ۔ ہوں ۔ ہوں ۔ شاباش ، بیٹھو نا فرخندہ ، بس ایک منٹ ۔

فرخندہ: ۔ نسرین کہاں ہے بھیا ۔؟

شیخ صاحب: ۔ بس ایک منٹ یوں ہی رہنا ۔ ایک مونچھ رہ گئی ہے شاباش ہاں ۔ ہوں ۔ بس اب ٹھیک ہے نا ، ہاں کیا پوچھ رہی تھیں فرخندہ ۔

فرخندہ: ۔ نسرین نظر نہیں آئی ۔

شیخ صاحب :۔ جب ہوگی یہاں تو نظر آجائے گی۔ ارے بھئی فرخندہ یہ جاوید میاں کیا بن کر آگئے ہیں ولایت سے۔ معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی دیہات سے واپسی ہوئی ہو۔

فرخندہ :۔ بھیا میری عقل خود حیران ہے۔ مگر اب ہوگا کیا۔ یہاں نسرین مل بل تو کچھ کی کچھ بن گئی ہیں۔

شیخ صاحب :۔ دونوں کچھ کے کچھ بن گئے ہیں صاحب دونوں۔ اب میری سمجھ میں تو آتا نہیں یہ سنجوگ۔

فرخندہ :۔ بھیا خدا کے لئے یہ تو نہ کہئے۔ بچپن کی منگنی ہے۔ میں نے اسی دن کے لئے دن گن گن کر برس گزارے ہیں۔ کہ جاوید ولایت سے آئے تو ان دونوں کے سہرے کے پھول کھلیں۔ دونوں پروان چڑھیں۔

شیخ صاحب :۔ انتظار تو مجھ کو بھی یہی تھا۔ مگر اب تم خود دیکھ لو کہ کوئی بھی مناسبت ہے ان دونوں میں۔ تم کو معلوم ہے کہ تمہاری پہلی بھابی مرحومہ کے اور میرے مزاج میں کس قدر فرق تھا۔ ان کو چقندر پسند مجھ کو نفرت شدید۔ وہ خس کا عطر لگائیں اور میں بھاگوں اس کی کمبخت خوشبو سے۔ میری جان جائے بھنڈیوں پر اور وہ اُبکائیاں لیں بھنڈی کے نام پر۔ مجھے شوق کہ ان کے صاف دانت دیکھوں اور وہ بغیر مسّی کے رہ نہ سکیں۔ نتیجہ کیا ہوا۔ وہ جاکر بیٹھ رہیں میکے، اور میں نے کہا خس کم جہاں پاک۔ ان کے جانے سے واقعی

خس نے عطر کی خوشبو بلکہ بدبو سے نجات مل گئی۔ لہٰذا خس کم جہاں پاک ، میں نے بالکل صحیح کہا۔

فرخندہ :۔ مگر بھیا ، نسرین اور جاوید تو ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔

شیخ صاحب :۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ مگر اب حالات کچھ اور نظر آرہے ہیں نسرین کو جس شدت سے انتظار تھا جاوید کا ، اسی قدر وہ جاوید کو دیکھ کر مایوس ہوتی ہے۔

فرخندہ :۔ اور جاوید بھی کچھ چپ چاپ سا ہے۔ البتہ ایک دن یونہی کہہ رہا تھا کہ امی جان ! نسرین تو ایک دم میم بن کر رہ گئی ہے۔

شیخ صاحب :۔ بے وقوف لڑکا ، تم کو کہنا چاہیے تھا کہ اے عقل کے دشمن صاحبزادے وہ آپ ہی کے لئے میم بن کر رہ گئی ہے۔ میں نے اس کو میم بنایا ہے۔ تاکہ ولایت میں تعلیم پانے والے ایک لڑکے کی صحیح شریک حیات بن سکے۔ مجھ کو کیا معلوم تھا کہ یہ صاحبزادے سالہا سال بعد ولایت سے اسطرح آئیں گے۔ گویا گاؤں سے غلہ جمع کر کے آئے ہیں۔

دیکھنا بیٹی ناہید سیاہی جلد پر تو نہیں آئی۔

ناہید :۔ جی نہیں ماموں جان بالوں ہی پر ہے۔

شیخ صاحب :۔ بالوں پر تو ہونا ہی چاہیے بیٹی ، ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا ،

سوال یہ ہے۔ کہ ولایت جا کر جاوید کو آخر ہوا کیا۔

فرخندہ:۔ وہ جو باتیں کرتا ہے ان کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہیں، وہ کہتا ہے کہ میں انگریز بننے نہیں گیا تھا پڑھنے گیا تھا۔ ایمانداری کے ساتھ پڑھا، اور امتحان بھی امتیاز کے ساتھ پاس کر کے آیا ہوں۔

شیخ صاحب:۔ تم کو معلوم ہے نسرین کیا کہہ رہی تھی۔ اس کے سامنے تو میں اسی طرح چپ رہ گیا گویا مجھے ناگوار ہوا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بڑا برمحل مصرعہ پڑھا تھا۔ اس سے کہنے لگی: کہ لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا۔

فرخندہ:۔ بڑا غضب ہو جائے گا بھیا! اگر ان دونوں میں یہی اختلاف رہا۔

شیخ صاحب:۔ غضب تو جو کچھ ہونا تھا میرے نزدیک ہو چکا ہے۔ اب حالات کچھ اس قسم کے ہیں کہ مشرق تو مشرق ہے اور مغرب مغرب یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔

فرخندہ:۔ میرے زندگی بھر کے ارمان کا یہ حشر ہوگا۔

شیخ صاحب:۔ اپنے ارمان سے زیادہ ان دونوں کے ارمانوں کا خیال کرو۔

(دروازہ ایک دم کھلتا ہے۔ اور نسرین نہایت تیزی سے آتی ہے)

نسرین:۔ ڈیڈی، ہلو آنٹی، ہلو ناہید۔ آپ لوگ کب آئے۔

فرخندہ:۔ بیٹی میں تو تم کو پوچھ رہی تھی بھتیا سے۔

ناہید :۔ میں آپ کے کمرے میں بھی آپ کو ڈھونڈھ آئی ۔

نسرین :۔ میں پکچر گئی تھی، ڈیڈی آپ نہیں گئے ۔

شیخ صاحب :۔ بیٹی میرا خضاب کا دن تھا آج ۔ ذرا دیکھنا۔

نسرین :۔ کیوں لگاتے ہیں ڈیڈی آخر آپ خضاب، اچھا میں جارہی ہوں۔ پکچر سے میرے ساتھ مسعود، ریاض اور خالد آئے ہیں۔ ان کو چائے پلانا ہے ۔

شیخ صاحب :۔ خانساماں سے کہہ بیٹا ذرا تیز سے چائے دے۔ اور وہ بڑا کیک استعمال کر ڈالو ۔

نسرین :۔ اچھی بات ہے، ناہید ابھی تو ہو نا، چلو تم بھی سب کے ساتھ چائے پی لو ۔

فرخندہ :۔ نہیں بیٹی اس کو رہنے دو ۔ وہ لڑکوں میں کہاں جائے گی ۔

نسرین :۔ یہ کیا بات ہوئی ؟ لڑکوں میں جانے سے کیا ہو جاتا ہے میں جو جارہی ہوں ۔

شیخ صاحب :۔ ناہید کو رہنے دو بیٹا تم جاؤ، خانساماں سے کہہ دینا یہاں بھی چائے بھیج دے ۔

نسرین :۔ (چلی جاتی ہے)

فرخندہ :۔ بھیا سچ مچ آپ نے بہت آزاد کر دیا ہے ۔

شیخ صاحب :۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے ضرورت سے زیادہ آزاد کر دیا ہے ۔ مگر تم کو بھی معلوم ہے کہ میں نے کیوں آزاد کیا ہے ۔ بار بار

مجھ سے یہ بات کہلواتی ہو۔ کہ میں نے اس کو جاوید کے قابل بنانے کی کوشش کی، وہ جاوید جو ولایت گیا تھا اور جس کے لئے مجھ کو خیال تھا کہ ولایت سے اسی قسم کی شریک حیات ڈھونڈھتا ہوا آئیگا تم کو معلوم ہے کہ جاوید کے ولایت جانے سے پہلے نسرین ایسی نہ تھی نسرین ناہید ہی کی قسم کی ایک لڑکی تھی، جس کو میرے خیال میں وہ لڑکا کبھی پسند نہیں کر سکتا تھا۔ جس نے سالہا سال ولایت میں گزارے ہوں گے۔ لہٰذا جاوید کے لئے میں نے نسرین کو یہ کچھ بنا ڈالا۔

جاوید :۔ (باہر سے آواز دیتا ہے) میں آ سکتا ہوں۔

ناہید :۔ بھائی جان آ گئے۔

شیخ صاحب :۔ کون جاوید میاں، آجاؤ بیٹے !

جاوید :۔ (آتے ہوئے) آداب عرض، ماموں جان میں گھر پہنچا تو معلوم ہوا۔ امی جان اور ناہید یہاں ہیں۔

شیخ صاحب :۔ اگر یہ نہ معلوم ہوتا تو بھی تم یہاں آ سکتے تھے۔ بیٹھو نا ادھر بلکل آؤ میرے پاس۔ آج برخوردار۔ مجھے تم سے کچھ صاف باتیں کرنا ہیں بات یہ ہے کہ میں آدمی ہوں ذرا صاف قسم کا، میرے ذہن میں جو الجھنیں تمہارے متعلق ہیں، انہیں، تم تک نہ پہونچانا، میرے نزدیک دیانت کے بھی خلاف ہے۔ اور تم سے بھی زیادتی ہے۔ کیوں بھئی فرخندہ مجھے صاف صاف بات کر لینا چاہیئے نا۔

جاوید :- آپ امی جان سے بے کار پوچھ رہے ہیں۔ اگر مجھ پر ان سے کچھ کم حق آپ کو حاصل ہے تو بے شک اُن سے اجازت لے لیجئے ورنہ میرے نزدیک تو اس کی ضرورت نہیں ہے۔

شیخ صاحب :- میں بغیر کسی تمہید کے براہ راست یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ تم ولایت سے آخر کیا بن کر آگئے ہو۔

جاوید :- ماموں جان اپنے نزدیک تو میں وہی بن کر آیا ہوں جو مجھ کو بن کر آنا چاہئے تھا۔

شیخ صاحب :- میں نے آج تک ولایت سے لوٹنے والے کسی طالب علم کو یہ نہیں دیکھا کہ وہ سوٹ پہن کر جائے اور شیروانی پاجامے میں واپس آئے۔ میرے تصور میں تم اس طرح آیا کرتے تھے کہ ولایت کی اعلیٰ تراشش کے اپٹوڈیٹ سوٹ میں موٹی سی کمانی کی فیشن ایبل عینک لگائے تم ٹرین سے اترو گے خالص انگریزی قسم کا مصافحہ کرو گے اور گھر پہنچ کر گھر کی فضائیں ہی بدل دو گے۔

جاوید :- مگر میں آپ کی امید کے خلاف شیروانی پاجامے اور دیسی جوتے میں ٹرین سے اترا۔ السلام علیکم کہہ کر آپ کے سامنے ادب سے جھک گیا۔

شیخ صاحب :- برخوردار اس میں سعادت مندی تو ضرور تھی مگر یہ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ تم لندن سے آ رہے ہو یا چھانگا مانگا سے۔ انگلستان سے آئے ہو یا قصور سے ؟“

جاوید :- میں سمجھتا تھا کہ میری اس سادگی اور میری اس مشرقیت کو آپ پسند فرمائیں گے۔ میں بے شک یہاں سے سوٹ پہن کر ان لوگوں کے ملک میں گیا تھا۔ جو یہاں آکر نہ شیروانی پہنتے ہیں نہ پاجامہ بلکہ اپنے ملکی لباس میں رہتے ہیں اور اپنی ہی معاشرت یہاں پیدا کر لیتے ہیں۔

شیخ صاحب :- بات تو تم معقول ہی کہہ رہے ہو۔ مگر میں ذرا وضاحت سے سمجھنا چاہتا ہوں۔

جاوید :- ماموں جان اس بات کا اندازہ تو مجھے وہاں جاکر ہوا کہ ہم ذہنی طور پر کس حد تک ان کی غلامی کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم ان کا کلچر اس طرح اوڑھ لیتے ہیں۔ گویا خود ہمارا کوئی کلچر ہی نہیں اور ہم ان کو بجا طور پر ناز کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ کہ ان کے کلچر نے ہم کو آدمی بننے کے قابل بنایا ہے۔ میرے ذہن میں صرف یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم اپنے وطن میں بیٹھے اُن کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور وہ ہمارے یہاں آکر بھی اصلیت نہیں بھولتے۔ اس خیال نے مجھ کو خود مشرقی کلچر کی طرف متوجہ کیا۔ اور میں نے وہاں رہ کر بجائے ذہنی غلامی کرنے کے اپنا کلچر ان کے سامنے پیش کیا۔

شیخ صاحب :- دیکھنا بیٹا خضاب کی سیاہی جلد پر تو نہیں آ گئی!

جاوید :- جی نہیں، ٹھیک ہے، ماموں جان آپ کو حیرت ہوگی کہ میں نے وہاں کے درزیوں کو شیروانی کا نمونہ دے کر شیروانیاں اس سے

زیادہ دام صرف کرکے بنوائیں۔ جتنے میں سوٹ بنتا ہے۔ مگر یہی صرف
شیروانی۔ میں صبح کے ناشتے میں بجائے دلیہ اور دودھ پینے کے
اور بجائے ٹوسٹ میٹ اور انڈے کے خود پوریاں پکاتا تھا۔
اور آلو کی چٹنی ترکاری کے ساتھ نہ صرف خود کھاتا تھا بلکہ اکثر
انگریز دوستوں کو اس ناشتے کا دلدادہ بنا آیا ہوں۔"

شیخ صاحب:۔ مگر برخوردار اس سے تو تم بھی انکار نہیں کر سکتے کہ ان
لوگوں میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔

جاوید:۔ میں ان کی خوبیاں چھوڑ کر نہیں آیا ہوں۔ آپ مجھ کو وقت کا
پابند پائیں گے۔ آپ مجھ کو محنتی اور جفاکش دیکھیں گے۔ کام کے وقت
کام اور تفریح کے وقت صرف تفریح۔ میرا بھی اصول ہے۔ معاملات
میں صفائی اور دیانت کا میں بھی قائل ہوں۔ مگر ان باتوں پر صرف
سوٹ پہن کر اور سگار پی کر ہی عمل نہیں ہو سکتا۔

شیخ صاحب:۔ برخوردار مجھے تمہاری باتوں کی معقولیت کا اعتراف ہے
مگر میری حماقت ملاحظہ ہو کہ میں نے محض تمہارے لئے نسرین کو
خدا جانے کیا کا کیا بنا دیا ہے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ولایت سے
واپس آکر تم جس قسم کی شریکِ حیات چاہو، وہ تمام صفات
تم کو نسرین میں مل سکیں۔ میں نے اس کو نہ صرف کالج میں پڑھایا
بلکہ خالص یوروپین ماحول میں رکھا۔ میں نے اس کو پیانو سکھوا دیا۔
میں نے اس کو ڈانس کی تعلیم دلوائی۔ وہ رائیڈنگ کر سکتی ہے۔ وہ سوئمنگ

جانتی ہے ۔ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی میں بے جوڑ معلوم نہ ہوگی ۔ وہ اس فراٹے سے انگریزی بولتی ہے اور اس کا لب و لہجہ اس قدر انگریزیت لئے ہوئے ہے کہ انگریزی اس کی مادری زبان معلوم ہوتی ہے ۔

جاوید :۔ میں یہ سب اندازہ کر چکا ہوں اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ آپ نے یہ سب کچھ میرے ہی لئے کیا ہے ۔ مگر حیرت صرف یہ ہے ۔ کہ اگر مجھ کو ان ہی تمام صفات کی ضرورت ہوتی تو اس نقل کی کیا ضرورت تھی ۔ میں اصل ہی اپنے ساتھ ولایت سے کیوں نہ لاتا ۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ولایت میں اتنا زمانہ گزارنے کے بعد بھی نسائیت کے اس رنگ سے طبیعت اجنبی ہی رہی اور ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ اس ولایتی حسن اور ان ولایتی اداؤں میں میرے لئے کوئی ہم جنسی نہیں ہے ۔

فرخندہ :۔ مگر بیٹا سوال تو یہ ہے کہ اب کیا ہوگا ۔

شیخ صاحب :۔ اس کو بات کرنے دو ۔ وہ بڑی گہری باتیں کر رہا ہے ۔ ہاں برخوردار ۔

جاوید :۔ ماموں جان ، وہاں رہ کر میں نے اپنے اوپر نسرین کے اسی تصور کو طاری رکھا ۔ جیسا میں اس کو چھوڑ گیا تھا ۔ وہی میک اپ سے پاک معصوم چہرہ ، وہی دوپٹہ ، وہی غرارہ اور شلوار اور وہی عید بقرعید ماتھے پر ٹیکہ ، ماموں جان ہماری مشرقی لڑکیوں میں جو ایک بے ساختہ جھجک اور جھپک ہے اس کا خدا کی قسم میں نے کہیں جواب

نہیں دیکھا۔ وہ شرم اور وہ لاج جو مشرقی نسائیت کی روح ہے اسی کے بغیر مغربی نسائیت بے روح نظر آتی ہے۔

شیخ صاحب:۔ کیا تمہارے خیال میں کوئی ایسی صورت ہے کہ نسرین کو پھر مشرقیت کی طرف واپس لایا جا سکے۔

جاوید:۔ مجھ کو پوری طرح اندازہ نہیں ہو سکا کہ نسرین اپنے موجودہ رنگ میں کس حد تک ڈوب چکی ہے۔ اگر اس نے اپنی اصلیت کی تغیر ابھی شروع نہیں کی ہے تو واپسی ناممکن نہیں ہے۔

فرخندہ:۔ نہیں بیٹا وہ ٹھیک ہو سکتی ہے۔ اس غریب کو جیسا بنا دیا گیا ہے وہ بن گئی ہے۔

شیخ صاحب:۔ خیر، خیر، میں اس قسم کی باتیں نہیں کرتا۔ برخوردار تم خود اس کا جائزہ لو اور اگر اس کو واپس لا سکو تو مجھ سے زیادہ شاید کسی کو مسرت نہ ہو۔

جاوید:۔ آپ سے کم خود مجھ کو بھی مسرت نہ ہوگی

شیخ صاحب:۔ ذرا اس سے بات کر کے اندازہ تو کرو۔ ناہید، بیٹی دیکھنا ذرا نسرین کے دوست گئے۔ یہ بات تم نے لاکھ روپے کی کہی ہے کہ اگر تم کو یہی وضع قطع اور یہی معاشرت پسند ہوتی تو اس نقل کی کیا ضرورت تھی۔ اصل ساتھ ہی لاتے، میں اس بات کی سچائی کا قائل ہو چکا ہوں۔

فرخندہ:۔ اگر کوشش کی جائے اور شادی کے بعد رفتہ رفتہ اصلاح کی جائے

تو وہ ٹھیک ہو جائے گی۔

جاوید:۔ امی جان بس یہی بات غلط ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نسرین کے لئے میرے احساسات کیا ہیں۔ مگر بغیر سمجھے بوجھے دو زندگیاں تلخ نہیں بنائی جاسکتیں۔

شیخ صاحب:۔ بالکل ٹھیک ہے، بھئی معاف کرنا، نہیں معلوم تھا۔ کہ تم اس قدر معقول انسان بن کر آئے ہو۔ میں تمہاری ظاہری وضع قطع کو تمہاری نامعقولیت ہی سمجھ رہا تھا۔

ناہید:۔ (آتے ہوئے) نسرین آپا اپنے کمرے میں اکیلی پیانو بجا رہی ہیں۔

شیخ صاحب:۔ میرے خیال میں تو تم ہی پہنچ جاؤ۔ برخوردار، خدا کرے تمہارے دلائل اس کو بھی اتنا ہی قائل کر دیں۔ جتنا مجھ کو کیا ہے۔

جاوید:۔ دیکھئے کوشش کرتا ہوں (جاتا ہے) کچھ وقفہ۔ پھر پیانو کی آواز رفتہ رفتہ قریب آتی ہے۔ جاوید اجازت چاہتا ہے۔ میں آسکتا ہوں

نسرین:۔ (پیانو بند کرتے ہوئے) کون منشی محمد جاوید صاحب (قہقہہ لگاتی ہے) BY JONE یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ تم نے جاوید، پیروں میں بندوق کے غلاف پہنے ہوئے اور یہ کیا نام ہے اس کوٹ کا۔ شیروانی، کس قدر عجیب چیز ہے یہ بھی اور معلوم نہیں بغیر موزوں کے تم یہ بڈروم سلیپر قسم کا جوتا کیسے پہن لیتے ہو۔

جاوید:۔ آپ کے دوست گئے۔

نسرین: - جب وہ چائے پی رہے تھے۔ میں نے تم کو جاتے دیکھا تھا مگر
میں نے بلایا نہیں، وہ لوگ مذاق اڑاتے تمہارا بلکہ مسعود پوچھ رہا
تھا کہ تمہارے جو cousin ولایت سے آئے ہیں وہ کہاں ہیں
اب میں کیا بتاتی کہ وہ چیز تم ہو، چیز (قہقہہ)

جاوید: - تم نے اچھا کیا کہ نہیں بتایا ورنہ میرے ساتھ تمہارا بھی مذاق اڑتا۔

نسرین: - But, don't know why - یہ تم بن کر کیا رہ گئے ہو
یہ تم کو ہوا کیا آخر۔

جاوید: - کچھ نہیں نسرین۔ صرف یہ ہوا کہ ولایت جاکر میری آنکھیں تھوڑی سی
کھل گئی ہیں کہ ہم انگریزوں کی کس شدت سے ذہنی غلامی کر رہے
ہیں۔ تم نے کبھی کسی انگریز کو بھی دیکھا ہے کہ اس نے تمہارا ملکی
لباس تمہارے ملک میں بھی آکر پہنا ہو۔

نسرین: - یہ تو بالکل ویسی ہی بات ہوئی کہ جیسے کوئی افریقہ جاکر کوڑیوں
کے ہار پہن لے۔

جاوید: - کیا تمہارے خیال میں تمہارا کلچر ایسا گیا گزرا ہے۔

نسرین: - What are you Talking - ہمارا کلچر ہی کیا ہے، یہی
کلچر جس کا تم نمونہ بنے ہوئے ہو -؟

جاوید: - ہاں بیشک یہ جیسا کچھ بھی ہے۔ مگر اپنا کلچر ہے۔ اور جس رنگ
میں تم رنگی ہوئی ہو۔ وہ خواہ کچھ بھی ہو تمہارا نہیں دوسروں کا ہے
اور تم پر تہمت معلوم ہوتا ہے۔

نسرین :۔ میں سمجھتی تھی کہ تم صرف وضع قطع میں بدلے ہو۔ مگر معلوم ہوا کہ تم ہر اعتبار سے اب سے سو سال پیچھے جا پڑے ہو۔

I wonder what is wrong with you.

جاوید :۔ ممکن ہے میرا قصور ہو مگر میں تمہارا قصور بالکل نہیں سمجھتا تم وہی بن گئی ہو۔ جو تم کو بنا دیا گیا ہے۔ اور جو کچھ تم کو بنایا گیا ہے، وہ بھی صرف اس لئے کہ ماموں جان کا خیال تھا کہ میں بھی ولایت سے وہی بن کر آؤں گا جو عام قسم کے نوجوان بن کر آتے ہیں جو اصلیت کو بھول جاتے ہیں اپنے وقار کو خود اپنی نظروں سے گرا کر خودنگری کے بجائے احساس کمتری میں مبتلا ہو کر دوسروں کے قالب میں اپنے کو ڈھال لیتے ہیں۔ ماموں جان نے تم کو میری نصف بہتر بنانے کی کوشش کی تھی۔

نسرین :۔ مگر تم وہاں سے نصف بدترین کر آ گئے۔ 'worst half' (قہقہہ لگاتی ہے)

جاوید :۔ ہاں نسرین مجھ سے یہ قصور ضرور ہوا کہ میں اپنے کو بھولا نہیں، کاش تم کو معلوم ہوتا کہ میں نے اس عرصے میں تمہارے اس تصور کی کیسی پرستش کی ہے۔ جیسا کہ میں تم کو چھوڑ گیا تھا۔ میں بے صبری سے منتظر تھا اس وقت کا جب میں آؤں گا۔ اور میری نسرین کی شرم آمیز محبت میں ڈوبی ہوئی نظریں جانے کیا کیا مجھ سے کہہ ڈالیں گی۔

نسرین :۔ یہ تم کس دنیا کی باتیں کر رہے ہو جاوید، کاش تم کو بھی معلوم ہوتا

کہ میں نے اس عرصے میں تمہارا کیا تصور قائم کر رکھا تھا۔ کہ ایک فیشن ایبل مہذب اور اپ ٹو ڈیٹ نوجوان اعلیٰ درجے کا سوٹ پہنے منہ میں پائپ لگائے ٹرین سے اترے گا۔ اور ہلو کہہ کر میری طرف دوڑے گا۔ اس کو حیرت ہو جائے گی کہ جس نسرین کو وہ ایک جاہل گنوار، اور دقیانوس لڑکی چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ اب اس کے خوابوں کی حقیقی جاگتی تعبیر بن گئی ہے۔

جاوید:۔ ہاں نسرین میں تم کو دیکھ کر قائل ہو گیا کہ واقعی خواب کی تعبیر الٹی ہوتی ہے۔

نسرین:۔ مجھ کو بات ختم کر لینے دو۔ تم ٹرین سے اس طرح اترے کہ میں سکتے میں آگئی۔ تم نے ایک ٹھنڈا سا سلام علیکم کیا۔ میری تمام امیدوں پر اوس ڈال دی۔ میں ایک دم بجھ کر رہ گئی۔ اب میں تم کو چھپاتی پھرتی ہوں۔ اپنے کسی دوست سے تم کو ملا بھی نہیں سکتی۔ میرے دوست تمہارا ذکر کرتے ہیں۔ اور میں ٹال جاتی ہوں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھ کو کچھ کم shock پہنچا ہے۔ مجھ کو تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم اپنے کو کھو کر آگئے۔ تم نے اپنے کو گنوا دیا ہے۔ You have lost your Self

جاوید:۔ اچھا اب ایک بات بتاؤ نسرین، جہاں تک میں محبت کو سمجھ چکا ہوں یا یہ کہو کہ سمجھ سکا ہوں۔ وہ تو اتنی کمزور چیز نہیں کہ ان سطحی اور ان ظاہری تبدیلیوں سے گھٹ بڑھ سکے۔

نسرین:۔ تم ناولوں اور افسانوں والی محبت کی مجھ سے بات نہ کرو۔ جب میں اپنی کھلی آنکھوں سے تم کو دیکھ رہی ہوں کہ تم اپنے کو مہذب دنیا کے لئے

"Panghing stock" بنا چکے ہو۔ جتنا میں آگے بڑھی ہوں اتنا ہی تم پیچھے ہٹ چکے ہو۔ تو میرے خیال میں میرا دماغ اتنا خراب نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ میں اب بھی تم سے محبت کا دعویٰ کروں۔ میں اتنا بڑا جھوٹ کبھی نہیں بول سکتی۔

جاوید:۔ تو پھر اس بات کو مانو نا کہ تم کو مجھ سے، میری ذات سے محبت یا وابستگی نہ تھی۔ بلکہ میری وضع قطع سے تھی۔

نسرین:۔ میں تم کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھے تم اب بھی عزیز ہو۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں۔ کہ میں اگر کسی بلّی کے بچے کو چمکارنے لگوں تو اس کو بحیثیت شوہر کے بھی قبول کر لوں گی۔ جاوید تم یہ خیال تو اپنے دل سے نکال دو۔ کہ ہم دونوں کی شادی ہو سکتی ہے۔

جاوید:۔ اچھا اگر میں اپنے اوپر جبر کرکے تمہاری مرضی کے مطابق اپ ٹو ڈیٹ بن جاؤں تو۔۔۔"

نسرین:۔ تو مجھ کو یہ معلوم ہوگا۔ کہ جیسے کھویا ہوا جاوید مل گیا مجھ کو۔

I assure I will be to glad.

جاوید:۔ نسرین اب مجھ سے سنو کہ تم جاوید سے نہیں بلکہ کسی درزی کی دکان میں رکھے ہوئے مجسمے سے وابستگی چاہتی ہو۔ جس کو درزی نے سوٹ پہنا کر گاہکوں کو دکھانے کے لئے رکھ چھوڑا ہو۔ جاوید کی جستجو ہوتی تو وہ تم کو مل جاتا۔ مگر اب جاوید تم کو نہ مل سکے گا۔ اپنے تصور میں جو سُوٹ تم نے اسے پہنا رکھے تھے۔ وہ ضرور مل جائیں گے۔ تم بالکل ٹھیک کہا کر

میں اپنے کو ولایت جاکر کھو آیا۔ مگر اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ تم نے گھر بیٹھے اپنے کو گم کر دیا۔

نسرین :۔ تم شاید برا مان گئے ہو۔ مگر مجھے امید ہے کہ اتنی عقل تم میں ضرور ہوگی کہ تم یہ سمجھ سکو کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنے دور ہو چکے ہیں۔

جاوید :۔ بہت دور، اتنی دور کہ میں تم کو واپس نہیں لا سکتا۔

نسرین :۔ نہ تم واپس لا سکتے ہو نہ میں واپس آنا چاہتی ہوں جاوید تم بہت پیچھے ہٹ گئے ہو۔ (شیخ صاحب مع فرخندہ اور ناہید کے داخل ہوتے ہیں)

شیخ صاحب :۔ بس میں یہی فیصلہ سننا چاہتا تھا میں نے تم دونوں کی تمام سن لی اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ واقعی مشرق مشرق ہے۔ اور مغرب مغرب۔ یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔

فرخندہ :۔ میری زندگی بھر کی تمنا کا یوں خون ہونا۔ قسمت میں لکھا ہوا تھا (رونے لگتی ہے)

جاوید :۔ امی جان ایسے حالات پیدا نہ کیجئے کہ رہے سہے تعلقات بھی ختم ہو جائیں۔ باوجود ان تمام باتوں کے میں نسرین کا قصور نہیں سمجھتا۔

فرخندہ :۔ نہیں بیٹا، قصور تو ہے میرے مقدر کا۔

شیخ صاحب۔ قصور دراصل میرا ہے اس قصور میں بھی نیک نیتی تھی کہ میں نے نسرین کو اس معیار پر لانا چاہا کہ ولایت سے واپس آنے والا جاوید اپنے کو کسی گھاٹے میں نہ سمجھے میرے حالات اگر مجھ کو اجازت دیتے تو شاید

میں نسرین کو بھی ولایت بھیج دیتا ۔

نسرین :۔ مگر ڈیڈی مجھ کو یقین ہے کہ میں انگلینڈ ENGLAND جاؤنگی
ضرور اور یورپ EUROPE کی سیر ضرور کروں گی ۔

فرخندہ :۔ بیٹی صرف تم یہ غور کرو کہ تم ایک مشرقی لڑکی ہو ۔

جاوید :۔ امی جان اب سمجھانا بے کار ہے ۔ میں تو نسرین کا ممنون ہوں کہ
اس نے نہایت صفائی کے ساتھ مجھ سے گفتگو کی ہے ۔

شیخ صاحب :۔ اس قدر صفائی کے ساتھ کہ میری طبیعت بھی صاف ہوگئی ۔
مجھ کو خود بھی اتنا اندازہ نہ تھا کہ اس تربیت نے نسرین کو اس حد
تک بدل دیا ہوگا ۔ کوا ہنس کی چال چلا اور اپنی بھی چال بھول گیا ۔

نسرین :۔ ڈیڈی ۔۔ (Are you talking seriously)

شیخ صاحب :۔ بس صاحبزادی آئندہ مجھ سے صرف میری مادری زبان میں گفتگو
فرمایا کیجئے ، میں اگر تم کو تعلیم اور آزادی دے کر یہ بنا سکتا ہوں ۔ تو مجھ کو
یہ بھی آتا ہے کہ میں تم کو اپنے ماحول میں واپس لاؤں ۔

نسرین :۔ مگر '[illegible]' یہ بات کیا ہوئی ہے ۔

شیخ صاحب :۔ میں نے تم کو اتنی آزادی دی تو میں ہی یہ بھی کر سکتا ہوں
کہ بحیثیت باپ کے اپنے اختیارات سے کام لوں اور تمہاری شادی
زبردستی جاوید سے کر دوں ۔

جاوید :۔ مگر ماموں جان معاف فرمائیے گا ۔ میں نسرین پر یہ ظلم نہیں کر سکتا

فرخندہ :۔ تم سے کیا مطلب ، بزرگوں کی باتوں میں کہیں بھی لڑکا اور لڑکی دخل

دیتے ہیں؟

نسرین:۔ آہ وہ زمانہ گذر گیا۔ اب لڑکے اور لڑکی یہ اندھا جوا نہیں کھیل سکتے۔

شیخ صاحب:۔ (روتے ہوئے) یہ دن دیکھنے کے لئے میں زندہ رہ گیا تھا میری لڑکی اور میرے سامنے اسطرح زبان چلائے۔

جاوید:۔ یہ بات آپ کو اس لئے بری معلوم ہوتی ہے کہ آپ کی معاشرت اور آپ کے ماحول کے خلاف ہے مگر نسرین کو آپ ہی کی تربیت نے اس صاف گوئی کا عادی بنایا ہے۔ تو اب اس کا رنج فضول ہے۔

فرخندہ:۔ بھیا آپ کیوں رو رو کر ہلکان ہو رہے ہیں۔

نسرین:۔ (جاتے ہوئے) شادی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کے لئے کسی کو اس طرح دبایا جاسکے۔ (I cam not ?oLREATEthis.)

کہہ کر چلی جاتی ہے۔

شیخ صاحب:۔ کاش یہ دن دیکھنے سے پہلے مجھے موت آجاتی۔

فرخندہ:۔ اللہ نہ کرے، مجھ بدنصیب کا آپ کے اور جاوید کے سوا ہے ہی کون۔

شیخ صاحب:۔ ناہید بیٹی دیکھنا جلد پر تو نہیں آ گئی خضاب کی سیاہی۔

ناہید:۔ جی ہاں شاید آنسوؤں سے پھیل گئی ہے سیاہی۔

شیخ صاحب:۔ بس تو پھر ٹھیک ہے۔ شکر ہے پروردگار تیرا۔ خود کردہ را علاج نیست۔

ایک آہ سرد)

⁂

"حضور"

حضور دراصل تخلص تھا اُن نواب صاحب کا جو ایک بین الملکی قسم کے عظیم الشان مشاعرے میں پہلے تو صرف نظر ہی آئے۔ مگر بعد میں سُنے بھی گئے، مشاعرے کے اسٹیج سکریٹری نے جیسے ہی اعلان کیا۔

"عالی جناب نواب گوہر مرزا صاحب حضور سے درخواست ہے کہ وہ اپنے کلام سے مستفید فرمائیں۔"

اسی وقت نواب صاحب اپنی جامہ دار کی شیروانی کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے اٹھے اسی جامہ دار کی کشتی نما ٹوپی کا زاویہ درست کیا۔ اور ایک دزدیدہ نگاہ اس طرف ڈالی جدھر سے ایک مصاحب قسم کے بزرگ ریشمی رومال میں بندھی ہوئی بیاض لے کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ان حضرت نے رومال کھولا اور نواب صاحب نے بیاض لیکر مائیکروفون تک

تشریف لانے کی زحمت کی اس اہتمام ہی نے مشاعرے کے ان سامعین کو جو سرکاری ذرائع سے فروخت کئے ہوئے ٹکٹ لے کر آئے تھے اپنے ارمان پورے کرنے کے لئے آمادہ کر دیا تھا۔ اس پر طرہ نواب صاحب کی وہ شدھ گائیکی جس میں انہوں نے مطلع شروع کیا اور پھر قیامت بالائے قیامت یہ کہ مصرعہ ثانی ناموزوں پڑھ گئے اب کیا تھا سامعین نے مشاعرہ سر پر اٹھا لیا اور بد مذاقی کی دلیل بن کر رہ گیا، ان کا مذاق نہ اڑانا۔ میں نے لاکھ ضبط کیا مگر جب یہ ضبط حماقت نظر آنے لگا۔ تو چند چست فقرے میری زبان سے بھی نکل گئے اور نواب صاحب نے قہر آلود نگاہوں سے مجھ کو بے تحاشہ ہنستے بھی دیکھ لیا۔ صدر مشاعرہ نے لاکھ میز پر ہاتھ مارے، خاموش رہنے کے لئے بار بار ہاتھ بلند کیا۔ خود اٹھ کر مائیکروفون پر آداب مشاعرہ کو ملحوظ رکھنے کی اپیلیں کیں مگر توبہ کیجئے۔ یہ طوفان بھی بھلا تھم سکتا تھا۔ آخر اسٹیج سکریٹری نے نواب صاحب کے کان میں آکر کچھ کہا اور نواب صاحب نے اپنے ریشمی رومال سے عرق انفعال کو خشک کر کے ڈھٹائی سے ایک اور تان لیکر وہی ناموزوں مصرعہ پھر جو شروع کیا تو ساری محفل پھر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اور مجھ کو اعتراف ہے کہ خود بھی عجیب مجنونانہ ہنسی ہنس رہا تھا۔ نتیجہ یہ کہ نواب صاحب نے پسپائی کی ٹھانی اور رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے واپس تشریف لے گئے تو اسٹیج سکریٹری نے نہ جانے

مجھ سے کب کا بدلہ لیا کہ میرے نام کا اعلان کر دیا ، پہلے تو اس نازک موقع پر اپنا نام سن کر سناٹے میں آ گیا مگر جب سولی پر جانا برحق نظر آیا تو میں نے مائیکروفون پر جا کر غزل شروع کرنے سے قبل عرض کیا کہ حضرت یہ واقعہ ہے کہ نواب صاحب کے بعد غزل پڑھنا اور خودکشی کرنا ایک ہی بات ہے ۔ مگر اس بھری محفل میں اسٹیج سکریٹری صاحب نے مجھ ہی کو سب سے مناسب قربانی کا بکرا سمجھ کر پیش کیا ہے لہذا اس قربانی کے لئے سر تسلیم خم ہے ۔”

اس کے بعد میں نے غزل شروع کی اور شکر ہے کہ میری کافی حوصلہ افزائی کی گئی ۔ مشاعرے کا رنگ جو نواب صاحب نے خراب کر دیا تھا وہ پھر درست ہو گیا اور بقیہ مشاعرہ نہایت کامیابی کے ساتھ جاری رہ کر ختم ہوا ۔”

آپ کو معلوم ہے کہ مشاعرے کے منتظمین شعراء کو بلانے کے لئے تو اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ اگر شاعر بیک وقت کئی موٹروں میں جانا چاہے تو اس کے دروازے پر موٹروں کی قطار لگا دی جائے گی مگر مشاعرہ ختم ہونے کے بعد ایک تو منتظمین میں سے کوئی نظر نہیں آتا ۔ اور اگر نظر آ بھی جائے تو وہ پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے ۔ چنانچہ اس وقت میں بھی مشاعرہ ہال سے بے والی وارث باہر نکل کر کسی کرایہ کی سواری کی فکر میں کھڑا تھا کہ ایک صاحب نے میرے قریب آ کر کہا ۔

"آپ کو نواب صاحب یاد فرماتے ہیں۔"

اور اس سے قبل کہ میری حیرت طول کھینچے، ایک کار میں سے خود نواب صاحب نے جھانک کر ارشاد فرمایا:۔

"تشریف لائیے، میں پہنچا دوں گا۔"

یہ موقع تکلف کا نہ تھا لہذا میں لپک کر کار میں جا بیٹھا جس میں نواب صاحب کے علاوہ چار پانچ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے بیٹھتے ہی نواب صاحب نے ڈرائیور سے فرمایا:۔

"بس بھئی چلو ۔۔۔"

میں نے نواب صاحب اور ڈرائیور دونوں کو سنانے کے لئے کہہ دیا:۔

"میو روڈ گڑھی شاہو تک جانا ہے مجھے۔"

مگر اس کا کوئی جواب مجھ کو نہ ملا اور سچ پوچھئے تو یہ ایسی کوئی بات بھی نہ تھی کہ اس کا جواب دیا جاتا مگر اب مجھ پر ایک کیفیت طاری تھی جس کو عرف عام میں ندامت کہتے ہیں کہ میں نے نواب صاحب پر فقرے چست کئے تھے ان کا مذاق اڑایا تھا اور ان پر ہنسنے والوں میں سب سے پیش پیش میں ہی تھا اور یہ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے بعد جب خود غزل سنانے گیا ہوں تو میں نے یہ کہہ کر تو گویا رہی سہی کمی بھی پوری کر دی تھی۔ کہ نواب صاحب کے بعد پڑھنا اور خودکشی کرنا ایک ہی بات ہے۔ میری ان تمام زیادتیوں کا جواب نواب صاحب نے اس شرافت سے دیا کہ مجھ کو

مشاعرے کے بعد والی کس مپرسی کے عالم میں دیکھ کر گھر پہنچانے کے لئے جا رہے ہیں۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ اور میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کن الفاظ میں اظہارِ ندامت کروں ادھر وہ سب بھی بالکل خاموش تھے۔ صرف کار کے فراٹے سنائی دے رہے تھے۔ مگر اب جو میں نے غور کیا تو کار کا رُخ گڑھی شاہو کے قطعاً مخالف سمت میں تھا۔ پھر خیال آیا کہ شاید کسی اور کو اتارنا ہو اس کے بعد میرا نمبر آئے۔ مگر کار ہم سب کو لئے ہوئے ایک کوٹھی میں داخل ہو کر پورچ میں ٹھہر گئی۔ اور جب سب اتر گئے تو نواب صاحب نے بڑی کرخت آواز میں کہا:۔

"ننھے خاں ان کو اتار کر گول کمرے میں لاؤ"

خیر یہاں اترنے اور گول کمرے میں جانے میں تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ مگر یہ تیور اور یہ لب و لہجہ کچھ عجیب ضرور تھا اور اس سے زیادہ عجیب ننھے خاں کے یہ الفاظ تھے کہ:۔

"اب اترو، چلو کسی طرح"

میں نہایت خاموشی سے اُتر کر ننھے خاں کے ساتھ جب نواب صاحب کے گول کمرے میں داخل ہوا ہوں تو نواب صاحب کے تیور دیکھ کر پاؤں تلے کی زمین نکل گئی وہ غصے میں آگ بگولا بیٹھے تھے اور ان کے تمام ساتھی کچھ عجیب سہمے سہمے ہوئے انداز سے دبکے ہوئے بیٹھے نظر آئے۔ مجھ کو دیکھتے ہی نواب صاحب نے نہایت مغلوب الغضب ہو کر

کہا :۔

"تم اپنے کو بہت بڑا شاعر سمجھتے ہو۔ دوسروں کی آبروریزی تمہارا مذاق ہے، میں تمہارے دربار کا مسخرہ تھا۔ سرکس کا جوکر تھا۔ آخر کیا سمجھ کر تم نے میرا مذاق اڑوایا۔"

ایک صاحب نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا :۔

"حضور.. یہی سب سے پیش پیش تھے۔"

نواب صاحب کڑک کر بولے :۔

"چپ رہو جی تم۔ تم سے تو میں ایسا سمجھوں گا کہ زندگی بھر نہ بھولو۔ تم نے ہی مجھ کو شاعری کی رائے دی تھی۔ تم ہی مجھ کو بیہودہ مشاعرے میں لے گئے تھے۔ تم ہی نے مجھ کو ایسی غزل بنا کر دی کہ ساری خاندانی عزت پر پانی پھر کر رہ گیا۔ اور کیوں بے نبو، بڑا بھیگی بلی بنا بیٹھا ہے۔ حرام خور یہ تو نے غزل کی طرز سکھائی تھی بڑا دعویٰ تھا تیرا کہ چھتیں اڑ جائیں گی۔ یہی ایک غزل رہے گی۔ نہ دیکھ لیا تو نے کہ تیرے بڑے بول کا سر کیسا نیچا ہوا ہے۔"

نبو نے دست بستہ عرض کیا :۔

"سرکار گستاخی معاف وہ مجمع ہی ناسمجھوں کا تھا۔"

نواب صاحب نے پیچ و تاب کھا کر کہا :۔

"ابے ناسمجھ کے بچے یہ مشاعرے میں پڑھنے کی طرز تھی ہی نہیں پہلا قہقہہ تو اس گٹکری ہی پر پڑا ہے جو تو نے تین دن کی محنت کے بعد

مجھ کو سکھائی تھی بات اصل میں یہ ہے کہ تم سب نے مل کر نہ جانے کب کا بدلہ مجھ سے لیا ہے۔"

اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہا:۔

"صورت سے تو بڑے شریف زادے نظر آتے ہو۔ اگر مرد کے بچے ہو تو اب اڑاؤ مذاق۔ اب اڑاؤ ٹھٹھے۔ اب بجاؤ تالیاں۔ اب مچاؤ شور۔ نواب تاجدار مرزا کی اولاد نہ کہنا اگر گولی نہ مار دوں، خون کے گھونٹ پی پی کر رہا ہوں اتنی دیر میں۔"

ننھے خاں نے کہا:۔

"آپ کے قدموں کی قسم سرکار اگر آپ نہ روک لیتے تو وہیں آنتیں ڈھیر کر دیتا۔"

نواب صاحب نے بیزاری سے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ مشاعرہ تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ اس بیہودگی کا نام مشاعرہ ہے مگر حیرت تو یہ ہے کہ سوائے میرے یہ سلوک کسی اور کے ساتھ کیوں نہ ہوا۔ حد یہ ہے کہ بہت سے بے سرے بھی پڑھ گئے، بہت سے بغیر گائے بھی غزل سنا گئے، کسی کی یہ ذلت نہ کی گئی اور کیوں جی تم نے جس طرز میں غزل پڑھی ہے وہ طرز کس نے بتائی تھی؟"

میں نے جان پر کھیل کر عرض کیا:۔

"یہ خود میری اپنی طرز تھی۔"

نواب صاحب نے بیاض میری طرف اچھال کر کہا:۔

"تو سناؤ میری ہی غزل اپنی اسی طرز میں۔"

میں نے بیاض کھول کر اس اکلوتی غزل کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ نواب صاحب کا قصور نہ تھا۔ مطلع تھا ہی ناموزوں۔ باقی اشعار پر نظر ڈالی تو وہ بھی بے بحر سے تھے۔ حد یہ ہے کہ بعض مصرعے خالص نثر میں تھے۔ نواب صاحب سے زیادہ انتظار نہ ہو سکا ڈانٹ کر مجھ کو تھرا دیا۔

"اب سناتے کیوں نہیں۔"

میں نے بڑی مہلک بات گھبرا کر کہہ دی:۔

"جناب والا یہ غزل ہی غلط ہے۔"

نواب صاحب گرجے:۔

"غلط ہے؟ کیا مطلب تمہارا غلط ہے یہ۔"

میں نے عرض کیا:۔

"یہ کسی ایسے شخص کی کہی ہوئی ہے جو شاعری نہیں جانتا۔"

نواب صاحب نے ایک صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہا:۔

"وہ گدھا۔ وہ نمک حرام۔ یہ بیٹھا ہے۔ بڑا شاعر بنا پھرتا ہے۔ اٹھائی گیرا کہیں کا۔ نقل گر ابے سنتا ہے یہ کیا کہہ رہے ہیں۔"

اُن صاحب نے کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"قصور وار ہوں سرکار۔"

نواب صاحب نے مجھ سے کہا:۔

تمہارے لئے کس نے کہی تھی غزل۔"

میں نے عرض کیا:۔

"خود ہی کہی تھی میں نے جنابِ والا۔"

نواب صاحب نے بڑے غور سے مجھ کو گھورا ۔۔۔ "تو گویا تم شاعری جانتے ہو پہلے سے۔ اچھا تو اس غزل کو ٹھیک سے لکھ کر اپنی دھن میں مجھ کو ابھی سناؤ۔ ننھے خاں ان کو قلم اور کاغذ دو ۔۔۔"

اس کو کہتے ہیں زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ مگر میں نے بھی ڈھٹائی پر کمر باندھ رکھی تھی سر پر کفن لپیٹ کر عرض کیا۔

"ابھی تعمیل حکم کرتا ہوں اگر آدھ گھنٹے کے لئے کوئی علیحدہ جگہ مل جائے تو یہ غزل ٹھیک کر دوں ۔۔"

نواب صاحب نے بڑے طنز سے کہا۔

"علیحدہ جگہ تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے کہ تم غزل کیسے بناتے ہو۔ بہتر ہے یہی سہی۔ لے جاؤ۔ ننھے خاں ان کو برابر والے کمرے میں یہاں

کوئی ان کو نہ ملے گا۔ جس سے یہ غزل بنوائیں ان کو خود ہی بنانا پڑے گی۔ میں جب تک زنانخانے میں ہو آؤں۔"

ننھے خاں نے مجھے ایک علیحدہ کمرے میں پہنچا دیا اور کمرے کے دروازے پر خود لٹھ لے کر بیٹھ گیا تاکہ میں بھاگنے نہ پاؤں۔ میں تو آج نہ جانے کس کا منہ دیکھ کر گھر سے نکلا تھا کہ اس مصیبت میں پھنس گیا۔ اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ ہی کیا تھا۔ کہ از سرِ نو یہ غزل کہوں اور آدھ گھنٹے کے اندر کہوں چنانچہ اسی غزل کے الفاظ موزوں کرنا شروع کر دیئے اور شکر ہے جب نواب صاحب کا مقطع موزوں کر رہا تھا۔ نواب صاحب کی گرج دار آواز گونجی:۔

"ننھے خاں لاؤ ان کو بلا کر۔"

چنانچہ میں ننھے خاں کی حراست میں پھر لا کر نواب صاحب کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ نواب صاحب نے مجھ سے پوچھا:۔

"بن گئی غزل۔"

میں نے عرض کیا:۔

"جی ہاں سنائے دیتا ہوں۔"

اور اب جو میں نے اپنی دھن میں مطلع پڑھا تو نواب صاحب کے تیور ہی بدل گئے۔ مسرت آمیز تعجب سے

بولے:۔

بھئی واہ کیا کہنا ہے۔ ابے سن رہا ہے شاعر کے بچے تو۔ اس کو کہتے ہیں غزل اور تو بھی سن لے تان سین کی دم۔ یہ کہلاتی ہے طرز۔ ہاں بھئی سناؤ مزا آگیا۔ کیا کہنا ہے۔ نشے آرہے ہیں۔"

اور میں نے مر کھپ کر پوری غزل سنادی تو نواب صاحب نے عجیب سوال کیا:۔

"یہ دھن اور اس دھن میں یہ غزل پڑھنا مجھ کو کتنے دن میں سکھا سکتے ہو؟"

میں نے بڑی احتیاط سے کہا "دو دن تو لگ ہی جائیں گے۔"

نواب صاحب نے کہا:۔

چلو تین دن سہی۔ چوتھے دن میری کوٹھی میں مشاعرہ کرو اور ان سب شاعروں کو بلاؤ جو آج تھے مشاعرے میں، تم کیا کرتے ہو؟"

میں نے کہا "ایک دفتر میں نوکر ہوں۔"

نواب صاحب نے کہا "کیا تنخواہ ملتی ہے؟"

میں نے کہا "پونے دو سو"

نواب صاحب نے بڑی بے پروائی سے کہا "پونے دو سو کے دو گنے ہوئے، ساڑھے تین سو۔ یہ ملے گی تم کو تنخواہ اور کام ہوگا مجھ کو غزلیں سکھانا۔ اور مجھے شاعر بنانا بولو منظور ہے۔"

مجال تھی کہ میں اس وقت نامنظور کہہ دیتا۔ میں نے دست بستہ عرض کیا: "خادم ہوں آپ کا"

نواب صاحب نے کہا ــ "بس تو آج کے چوتھے دن مشاعرہ طے رہا۔ ننھے خاں ان کو ایک مہینے کی تنخواہ پیشگی دے کر رسید لے لو۔"

میرا ارادہ تھا کہ اس وقت بچ جاؤں تو پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کروں گا۔ مگر جب ساڑھے تین سو کی رسید دینا پڑی تو پتہ چلا کہ اب تو باندھ دیے گئے مستقلاً۔ بہرحال چوتھے دن جو مشاعرہ ہوا تو اس میں نواب صاحب خوب خوب چہکے۔ اور ان کا خوب رنگ جما۔ نتیجہ یہ کہ مشاعرے کے بعد میری تنخواہ پورے چار سو کر دی گئی۔ اور نواب صاحب نے مجھ کو اپنی پیشی میں طلب کر کے فرمایا۔

"آئینہ"

جب میں نے اس سے پہلی مرتبہ اظہارِ مدعا کیا تو اس نے مجھ کو تحفے میں آئینہ دیا۔ اس بے محل تحفے کا مفہوم میں جلدی میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ اور اس کا شکریہ ادا کر کے وہ آئینہ گھر لے آیا۔ میرے گھر میں خدا کے فضل سے اور بھی بہت سے آئینے تھے۔ مگر میں نے اس آئینہ کو خاص طور پر صرف اپنا ذاتی منہ دیکھنے کے لئے رکھ دیا۔ اور اس تحفے کا مفہوم سمجھنے کی جتنی بھی کوشش کی اتنے ہی اس کے مفہوم پیدا ہوتے چلے گئے کہ اس نے بڑی فصاحت کے ساتھ میرے سوالِ شوق کا یہ جواب کہ "میرا دل تمہارے لئے آئینہ کی طرح شفاف ہے" کبھی خیال آیا کہ اس نے آئینہ دے کر گویا مجھ سے یہ کہا ہے کہ

"بس نازک است شیشۂ دل در کنار یار"

ایک مرتبہ اچانک یہ مفہوم ذہن میں ابھرا کہ اس نے آئینہ دے کر غالب کا یہ شعر پڑھا ہے ؎

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے۔
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا۔

آخر میں نے اپنے تنہا دوست سلیمان سے ایک دن یہ پورا قصہ کہہ دیا۔ کہ میں کب سے نازلی کے لئے ایک پیغام اپنی نگاہوں میں لئے پھر رہا تھا اور یہی وہ راز تھا۔ جو اور کسی پر تو کیا سلیمان پر بھی کبھی ظاہر نہیں کیا۔ کہ اس راز کی دوشیزگی ختم نہ ہو جائے۔ مگر اب جبکہ اس امید موہوم نے امکان کی شکل اختیار کرنا شروع کر دی ہے اور نگاہوں کے اس یک طرف پیغام کے جواب بھی آنے لگے ہیں۔ لہٰذا اس کو اب ایسے دوست پر ظاہر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ سلیمان نے اس قصے کو شروع سے آخر تک بڑی دلچسپی کے ساتھ سن کر کہا۔

"مگر سوال تو یہ ہے کہ تمہاری طرف سے تو خیر ہر حماقت کی امید ہو سکتی ہے۔ مگر نازلی کے متعلق جو تم یہ کہہ رہے ہو کہ اس نے تمہارے حوصلوں کو شہہ دی ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی!"

میں نے کہا ـــــ "جہاں تک سمجھ میں آنے کا تعلق ہے خود میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ اور میں سوائے اس کے اور کچھ نہ سمجھ سکا۔ کہ میری شب چونکہ صادق تھی لہٰذا یہ خواب کی تعبیر بنتا نظر آنے لگا۔

سلیمان نے بڑی بے فکری کے ساتھ کہا ـــ "بھائی تمہیں ایسے عشق اور اپنی

حسرت کی پڑی ہے۔ مجھے تو نازلی کی صحت کی طرف سے خدشہ پیدا ہو گیا کہ آخر اس نے اپنی صحت کی کس خرابی کے ماتحت تمہارے اس احمقانہ پیام کی رسید بھی تم کو دے دی۔ مجھے تفصیل سے بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا تھا۔ بات کیسے شروع ہوئی۔ تم نے کون سا پھونکا کہ نازلی ایسی قیامت کو رام کر لیا۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ نازلی کے لئے نہ جانے کتنے دلوں میں چور موجود ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو گے کہ نازلی کے امیدواروں میں مختلف حیثیتوں سے مختلف معقول لوگ بھی ہیں۔ اگر تم ان کو اپنی مصوری کی روح سمجھتا ہے۔ اور اس کی ہر تصویر میں نازلی کا کوئی نہ کوئی پر تو بہت خستگی کے ساتھ آ ہی جاتا ہے۔ شہاب اس کو اپنا موضوع شعر سمجھتا ہے۔ پرسوں کی پارٹی میں تم نے دیکھا کہ شہاب نے اپنی کئی نظمیں سنانے کو سنا دیں مگر جب نازلی آ گئی تو اس کی نظم میں جیسے جان سی پڑ گئی۔ اس کے ترنم میں ایک خاص کھنک پیدا ہو گئی۔ اور اس کے اشعار ذی روح نظر آنے لگے۔

میں نے الجھ کر کہا ”صاحب مجھ کو سب معلوم ہے آپ سے زیادہ میں خود حیران ہوں، مگر واقعہ صرف یہ ہے کہ کل کا موسم تو تم کو یاد ہو گا۔ کس قدر ارمان انگیز بن گیا تھا۔ اور قیامت یہ کہ جس وقت یہ رس کی بوندیں گرنا شروع ہوئی ہیں۔ میں نازلی کے ساتھ تھا۔ ہم دونوں بارش سے بچنے کے لئے باغ کے ایک گھنے درخت کے نیچے آ گئے۔ ہوا کے سرد اور نم جھونکوں نے اس کی دھانی ساڑی کا آنچل کچھ اس طرح

ہوا میں لہرایا کہ میں نے اس کی طرف بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس نے مسکرا کر نظریں جھکا لیں۔ اور بڑی ہی عجیب سی کھنکتی ہوئی آواز میں کہا۔

" یہ موسم دیکھئے اور قدرت کا یہ مذاق کہ ساتھ کون ہے آپ؟ " سلیمان نے قہقہہ لگا کر کہا۔ " مجھے اس سے اسی قسم کی بلیغ شرارت کی امید تھی۔

میں نے سلیمان کے اس مسخرے پن پر تلخی سے کہا۔ " مگر آپ نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اس وقت بہت ہی سنجیدہ تھی۔ پھر اس نے کہا کہ اس موسم پر آپ کو غصہ نہیں آتا۔ اس کے جواب میں نہ جانے کہاں سے مجھ میں اتنی جراءت پیدا ہو گئی۔ کہ میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہاں نازلی مجھ کو بیحد غصہ آتا ہے کہ یہ موسم ہے یہ فضائیں اور تم بھی ——— مگر اس تمام اجتماع کا کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے نہایت دلربا قسم کے شرمیلے انداز سے کہا کہ مفہوم تو پیدا کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ " بس میرے لئے جراءت کے واسطے اتنی ہی اجازت کافی تھی میں نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

سلیمان نے بات کاٹ کر کہا۔ " بھائی، وہی تو تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تم نے دل کس طرح کھول کر سامنے رکھا۔ وہ الفاظ کیا تھے۔ ان کا جواب کیا تھا۔ نازلی کا ذرا تفصیل سے بتاؤ تو سہی۔

میں نے کہا۔ " بھئی میں نے یہی کہا کہ نازلی کاش! تم کو معلوم ہوتا

کہ تمہارے لئے میرے جذبات کیا ہیں؟"

سلیمان نے کہا ۔ "خیر یہ آپ کہتے تو آپ سے یہاں نہیں، بلکہ اس وقت ہسپتال میں ملاقات ہوتی اور آپ نازلی کے اخلاق کی شکایتوں کے دفتر کھول دیتے ۔"

مجھے سلیمان کی یہ بے جا ظرافت ہمیشہ زہر لگتی ہے ۔ میں نے اس کو ڈانٹا، بکواس نہیں کرتے، مجھ سے پوری بات سننا چاہتے ہو، تو سنو ورنہ جہنم میں جاؤ ۔"

سلیمان نے نہایت سنجیدگی سے اپنے چہرے کی مسکراہٹ سمیٹتے ہوئے کہا ۔ "اچھا اب میں سنجیدگی سے سنوں گا ۔ بشرطیکہ تم نے سنجیدگی باقی رہنے دی ۔

میں نے کہا ۔ "ہاں تو جب میں نے کہا کہ کاش، تم کو معلوم ہوتا کہ میں تمہارے لئے جذبات رکھتا ہوں ۔ تو اس نے حیرت سے مجھ کو گھور کر دیکھا دیر تک چپ رہی اور پھر بڑی سادگی سے پوچھا کہ کیا آپ بھی کچھ جذبات رکھتے ہیں ۔ گویا اشارہ تھا کہ میں اپنا فسانۂ غم سنا ڈالوں ۔ چنانچہ میں نے اس کے سامنے واقعی اپنا دل اور دل کی ہر وہ کیفیت جو اس کے لئے تھی ۔ پیش کر دی وہ خاموشی سے سر جھکائے سنتی رہی اپنی انگلیوں سے کھیلتی رہی پیمائش دلما میں مصروف رہی ۔ لیکن انکھیوں سے کبھی کبھی مجھ کو دیکھتی رہی اور دیکھ دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیرتی رہی ۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا ۔ اور جب

بارش ختم ہوگئی تو ہم دونوں درخت کے سائے سے نکل کر بازار کی طرف چل دیئے۔ اس نے ایک دوکان سے اپنے لئے کچھ سامان خریدتے ہوئے ایک آئینہ بھی خریدا اور شرم سے گردن جھکا کر، بلکہ ساری کا آنچل چباتے ہوئے مجھے دے دیا اور کہا کہ یہ میری طرف سے تحفہ ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ یہ تحفہ کیا معنی رکھتا ہے۔ سلیمان نے غور کرنے کے بعد سنجیدگی سے کہا۔ میرے خیال میں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ؎

چاہتے ہیں خوب رُوؤں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے۔

میں نے اس زہر کو شربت کے گھونٹ کی طرح نگل کر کہا سلیمان تم کو مذاق کرنے کا صرف یہی موقع ملا ہے۔ کاش میں نے تم سے یہ سنجیدہ بات ہی نہ کی ہوتی۔

سلیمان نے قریب کھسک کر میرے گھٹنے پکڑتے ہوئے کہا: خدا کے لئے مجھ کو غلط نہ سمجھو، میں بخدا مذاق نہیں کر رہا ہوں بلکہ مجھے اس نازنین پر سخت غصہ ہے کہ اس نے تم سے اتنا سنجیدہ مذاق کیوں کیا، وہ اگر بہت حسین ہے اور تم اگر تھوڑے سے کالے، تھوڑے سے بھونڈے، اور تھوڑے سے گویا کریہہ المنظر ہو تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ تم سے یہ

ذاتیاتی مذاق کرے۔ ایک تو تمہاری یہ حماقت کہ تم اس کو سمجھے بغیر اظہارِ عشق کر بیٹھے مگر اس کے باوجود یہ اس کی بیہودگی تھی، کہ تم کو آئینہ دکھایا اس نے۔" اور مجھے یقین ہو گیا کہ سلیمان سے اس مسئلہ پر گفتگو کرنا میری شدید غلطی تھی۔ میں نے سلیمان کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور باوجود اس کے کہ لعنت ہے اس دوستی پر کہ دوست کا اس نازک موقع پر بھی مذاق اڑایا جائے۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے وہی آئینہ، وہی تحفۂ محبت اٹھا کر دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ ہر چند کہ اس وقت یہ آئینہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ تم تھوڑے سے کالے، تھوڑے سے بھونڈے اور تھوڑے سے کریہہ المنظر ہو مگر آج زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے آئینہ کو جھوٹا سمجھا۔ ابھی میں آئینہ دیکھ ہی رہا تھا۔ کہ ملازم نے لا کر ایک لفافہ دیا۔ یہ نازلی کا خط تھا۔ اس میں لکھا تھا۔۔"

"جناب! یہ آئینہ آپ کو اس لئے دیا گیا ہے کہ آپ
کبھی کبھی اس کو دیکھ لیا کریں۔ اور مسور کی دال سے

پرستامیز فرمایش۔

"نازلی"

میں چونکہ اہلِ زبان ہوں، لہٰذا اس محاورے کو ذرا" سمجھ کر اب میں سلیمان کے پاس جا رہا ہوں۔ اپنے دست کو منانے، اور اس سے کہنے کہ زندگی بھر میں صرف ایک آئینے نے مجھ سے سچ بولا ہے۔ جو تم ہو، باقی ہر آئینہ مجھ سے جھوٹ بولتا ہے۔

⁂

"چور دروازہ"

تڑاخ سے کوئی شے فرش پر گری۔ یہ شیشے کے برتن کے ٹوٹنے کی آواز تھی۔ میں گہری نیند سو رہا تھا۔ آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ ذرا دیر بعد ایک اور جھناکا ہوا۔ پھر تو لگاتار چھن چھن کر کے شیشے ٹوٹنے لگے۔ فرنیچر ٹوٹنے لگا۔ اور دھما دھم کی آوازیں آنے لگیں۔ شور اوپر کی منزل پر ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو آدمی گتھم گتھا ہو کر بڑے ہی وحشیانہ انداز میں لڑ رہے ہیں۔

جاڑوں کی سنسان رات تھی۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی، سردی کے مارے برا حال تھا۔ میں سہما ہوا لحاف کے اندر دبکا، سکتے کے عالم میں خاموش پڑا رہا۔ کئی منٹ بعد رات کے سناٹے میں پروفیسر کی آواز سنائی دی۔ وہ غصے سے چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"بیہودہ، بدتمیز، نامعقول کہیں کا۔"

"نکل جاؤ یہاں سے۔"

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔"

پھر لکڑی کے زینے پر بھاری بھاری قدموں کی آہٹ ابھری۔ دروازہ کھلا اور تیزی سے بند ہو گیا۔

میں اسی طرح خوف زدہ بستر کے اندر لیٹا رہا۔ ذرا دیر بعد میرے کمرے کے دروازہ پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔

"شہیر، مسٹر شہیر!"

یہ پروفیسر کی آواز تھی۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے اس وقت اٹھ کر دروازہ کھولنا مناسب نہ سمجھا۔ مسٹ مارے خاموش پڑا رہا۔ پروفیسر رک رک کر دھیمے لہجہ میں مجھ کو پکارتا رہا۔ آخر اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"یہ شخص تو بڑی خراب نیند سوتا ہے" اور بڑبڑاتا ہوا اوپر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔ بے چینی سے پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔

سویرے جب میں پروفیسر کے پاس گیا تو میں نے دیکھا، کمرے کے اندر شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں ٹوٹے ہوئے صوفے پر پروفیسر تھوڑی پر ہاتھ رکھے خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بے حد پریشان نظر آرہا تھا۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور آنکھیں سوجی

ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے تمام رات اسی ٹوٹے ہوئے صوفے پر جاگ کر گزاری ہے ۔ اسی عالم میں اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس کو اسی طرح خاموش دیکھ کر میں نے پوچھا "پروفیسر صاحب خیریت سے تو ہیں؟"

بڑی بیزاری سے بولا:۔

"جی ہاں، سب خیریت ہی ہے ۔" پھر اس نے بکھرے ہوئے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھ نہیں رہے ہیں آپ یہ خیریت۔"

میں نے اظہارِ تعجب کرتے ہوئے کہا۔ "آخر یہ کیا ہوا۔۔۔؟"

وہ اسی طرح تلخ لہجہ میں بولا۔ "مجھ سے سوال کرنے کے بجائے تم خود کیوں نہیں سوچتے کہ میں کتنا احمق واقع ہوا ہوں۔" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کی بات کا کیا جواب دوں۔ آخر وہ خود ہی کہنے لگا۔

"اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ آج انسان بے حد SADIST ہو گیا ہے۔"

اس بات کا بھی کمرے میں بکھرے ہوئے بے ترتیب ٹوٹے پھوٹے سامان سے بظاہر کوئی تعلق معلوم نہ ہوتا تھا لہذا کچھ کہتے ہوئے مجھ کو جھجک محسوس ہوئی۔ مجھ کو خاموش دیکھ کر وہ بڑے بجھے ہوئے لہجہ میں بولا۔

"بات صرف اتنی ہے کہ گزشتہ کوئی گیارہ بجے ایاز صاحب تشریف لائے تھے۔ طبیعت میری خراب تھی، اس لئے جلدی سو گیا تھا۔ انہوں نے آکر

زبردستی مجھے جگایا۔ نشے میں دھت ہو رہے تھے۔ قدم کہیں کے کہیں پڑ رہے تھے۔ کہتے کچھ تھے، زبان سے نکلتا کچھ اور تھا۔ آتے ہی جیب سے بوتل نکالی اور شغل بادہ نوشی شروع کر دیا۔ میرے سپرد بیرہ گیری کی خدمت ہوئی۔ اس لیے اگر یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں رات کے وقت اپنی ضرورت کے لئے بھی کبھی ملازم کی نیند نہیں خراب کرتا۔ لہذا وہ جو آرڈر کرتے گئے میں اس کی تعمیل کرتا رہا۔" وہ بڑے اطمینان سے ایک ایک تفصیل بتاتا رہا۔ اب نہ اس کے چہرے پر وہ جھنجھلاہٹ تھی اور نہ لہجے میں تلخی تھی۔ البتہ باتوں میں بلا کا طنز تھا۔

"تو صاحب مجھ سے کچھ حکم عدولی ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ آپے سے باہر ہو گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا اندازہ آپ کمرے کے اس حلیہ سے کر سکتے ہیں۔ وہ اُدھم مچایا کہ اب آپ سے کیا عرض کروں۔"

"میں نے کہا شور تو کل رات میں نے بھی سُنا تھا۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "آپ تو بڑی بے خبر نیند سوتے ہیں۔ میں نے تو آپ کو آوازیں بھی دیں مگر آپ کی آنکھ نہ کھل سکی۔" وہ وقت بڑے تکلف کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔

میں خواہ مخواہ پشیمانی کا اظہار کرنے لگا۔ "نیند تو واقعی میری بہت خراب ہے۔ میرے سر کے اوپر اتنا بڑا ہنگامہ ہوا۔ اور میری آنکھ تک نہیں کھلی۔" پھر میں نے اس سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو آپ کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا ۔ " زیادتی ، ہاں بھئی یہی کہہ لو ۔" میں نے سوچا کہ لفظ زیادتی کا استعمال کر کے میں نے پروفیسر صاحب کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اس لئے کہ یہ تو سراسر ظلم تھا۔ لہٰذا میں نے اس کا تدارک کرنے کی غرض سے کہا۔

" معاف کیجئے گا پروفیسر صاحب مجھ کو صحیح طور پر آپ دونوں کے تعلقات کا اندازہ نہیں۔ مگر اتنا ضرور عرض کر دوں گا کہ ایاز کا اب یہاں آنا جانا قطعی بند کرا دیجئے۔"

" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا " اب میں نے یہی سوچا ہے ۔"

میں نے اس سلسلے میں زیادہ کہنا خلاف مصلحت سمجھا۔ علاوہ ازیں دفتر کا وقت ہو گیا تھا۔ میں پروفیسر صاحب سے رخصت لے کر دفتر کی جانب چل دیا۔ لیکن راستہ بھر میں اس کے متعلق سوچتا رہا۔ دل ہی دل میں اس کی ضرورت سے زیادہ بھلمنساہٹ پر کڑھتا رہا۔

میری نئی نئی ملاقات تھی۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے مجھ کو ابھی ہفتہ بھر بھی نہیں ہوا ہوگا۔ وہ میرے بڑے بھائی کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ اسی لئے مجھ کو اس کے ذاتی حالات کا بہت کچھ علم تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے حالات کے خلاف کبھی بغاوت کرنے کی جرأت نہیں کی اور ہمیشہ زندگی سے سمجھوتہ قائم رکھا۔ اس سمجھوتہ بازی میں حادثات کو بہت بڑا دخل تھا۔ وہ مشکل سے دس برس کا تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ماں نے بھلے گھر کی بہو بیٹیوں کی طرح اولاد کو بھی، سب کچھ جانا

اور انہی کے سہارے پورا رنڈاپا گزار دیا۔ عزیزوں نے عقد ثانی کے لئے بہت اصرار کیا مگر انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ ان کے اس انکار سے خاندان والوں سے کچھ اس قدر بدمزگی بڑھی کہ انہوں نے سب سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ بات کی آنی دھنی تھیں۔ کہ بڑے سے بڑا وقت دیکھا مگر کسی رشتہ دار کے آگے ہاتھ نہ بڑھایا۔ شوہر نے مرتے وقت آتنا بھی اثاثہ نہ چھوڑا۔ جس سے سال چھ مہینے کٹ جاتے۔ جہیز میں جو دو چار زیور ملے تھے وہی ان کا کل سرمایہ تھا۔ جس کو فروخت کر کے انہوں نے کپڑا سینے کی مشین خرید لی اور پاس پڑوس کے رہنے والوں کے کپڑے سی سی کر اپنا اور چار بچوں کا پیٹ پالتی رہیں۔

جس وقت باپ کا انتقال ہوا وہ چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ بیوہ ماں نے کسی نہ کسی طرح اس کی تعلیم جاری رکھی۔ خود اس کو بھی پڑھنے کی لگن تھی دن بھر اسکول میں پڑھتا شام کو ایک جلد ساز کی دوکان پر کاغذ کاٹنے کی مشین چلاتا ـــ جس سے اس کی پڑھائی کی فیس نکل آتی۔ رات کو اکثر ایسا ہوتا کہ گھر میں جلانے کا تیل ختم ہو جاتا۔ تو وہ میونسپلٹی کے لیمپ کی روشنی میں جاکر رات گئے تک پڑھا کرتا۔ دھندلی روشنی میں آنکھوں پر زور دے کر پڑھنے سے بینائی خراب ہو گئی۔ اس لئے کمسنی میں ہی اس نے موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ غرض یہ کہ اس نے ابتدائی زندگی بڑی تنگدستی میں بسر کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر برسر روزگار ہوا تو تین جوان بہنوں کی شادی کی فکر دامن گیر ہو گئی۔

سب سے چھوٹی بہن کی شادی کئے اسے تین چار ہی سال ہوئے ہیں کہ وہ فارغ ہوا تھا۔ خود اب تک بیاہ نہیں کیا تھا۔ ماں زندہ ہوتیں تو شاید وہ ازدواجی زندگی میں الجھ جاتا مگر اب کون ایسا تھا۔ جو گھر بسانے کے لئے مجبور کرے۔ بہنیں اپنے گھر بار کی ہو چکی تھیں۔ اور اب اس کی عمر بھی چالیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ چہرے کے خدوخال بھدّے ہو چکے تھے۔ قویٰ مضمحل ہوتے جا رہے تھے۔ زیادہ ذہنی مشقّت کرنے کے باعث وہ اپنی عمر سے زیادہ سن رسیدہ معلوم ہونے لگا تھا۔

گھر میں وہ بالکل تنہا رہتا تھا۔ دیکھ بھال کے لئے ادھیڑ عمر کا ایک ملازم تھا جو بہرہ بھی تھا۔ اور اس کو سجھائی بھی کم دیتا تھا۔ ان خامیوں کے باوجود وہ کئی سال سے اس کے ساتھ نباہ رہا تھا۔ لیکن عزلت نشینی کی زندگی سے آدمی کا مزاج جس قدر وہمی اور چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اس میں نام کو نہیں تھا۔ پہلی بار جب میں بھائی جان کا خط لے کر اس کے پاس گیا۔ تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا تھا۔ خط پڑھتے ہی بولا۔ نہیں بھئی تم کو یہاں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ نیچے کا کمرہ خالی کرائے دیتا ہوں۔ آج ہی اپنا سامان لے کر آ جاؤ۔ چنانچہ میں اسی روز شام کو ہوٹل سے اپنا سامان اٹھا کر اس کے یہاں آ گیا۔ یوں تو دن میں میری اس سے کئی بار ملاقات ہوتی تھی لیکن بات چیت کرنے کے معاملے میں وہ بڑے بخل سے کام لیتا تھا۔ البتہ ایاز کا ذکر کبھی آ جاتا تو وہ ذرا کھل کر

بات کرتا تھا ۔

ایاز سے ابھی تک میری ملاقات نہیں ہوئی تھی ۔ پروفیسر کی گفتگو سے مجھ کو اس کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ جن دنوں پروفیسر اس شہر میں نیا نیا آیا تھا ۔ اسی زمانے میں ایاز سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی ۔ وہ اس کے پاس کیریکٹر سارٹیفکٹ لینے آیا تھا ۔ کہیں ملازمت کی کوشش کر رہا تھا اس کے لئے یہ سارٹیفکٹ چاہیے تھا ۔ ایاز نے اسی سال میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا ۔ باپ پر فالج گرا تھا ۔ وہ اپاہجوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے ۔ بڑے بھائی پر گھر کا سارا بار تھا لہذا وہ آگے تعلیم دلانے کے حق میں نہیں تھا ۔ پروفیسر نے اس سے گفتگو کی تو اس کی ذرا ہی دیر میں اس کی ذہانت کا اندازہ ہو گیا ۔ وہ اس سے کچھ اس درجہ متاثر ہوا کہ ملازمت کا خیال ترک کر کے اس کو تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا ۔ خود ایاز کی بھی یہی خواہش تھی بی ۔ اے تک اس کی تعلیم کا سارا بار پروفیسر برداشت کرتا رہا ۔ اب وہ کسی سرکاری محکمہ میں کسی اچھے عہدے پر ملازم ہو گیا تھا ۔

اس روز شام کو دفتر سے چھوٹتے ہی میں سیدھا پروفیسر صاحب کے پاس پہنچا ۔ اس لئے شام کی چائے ہم دونوں بلا ناغہ ایک ساتھ ہی پیتے تھے ۔ اوپر جا کر میں نے دیکھا کہ میز پر چائے کا سامان رکھا تھا ۔ اس دن کچھ خاص اہتمام بھی کیا گیا تھا مگر پروفیسر صاحب کا کہیں پتہ نہ تھا ۔ میں نے لائبریری کے اندر جا کر دیکھا وہاں بھی اس کا پتہ نہیں تھا ۔ اب تو مجھ

کو تشویش ہوئی اس لئے کہ وہ عام طور پر اپنا زیادہ وقت اسی مختصر سی ذاتی لائبریری میں گزارتا تھا۔

لائبریری سے نکلتے ہوئے میری نظر برابر والے کمرے کی جانب اٹھ گئی۔ پروفیسر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اس کو دیکھا تو حیرت سے چونک پڑا۔ اس وقت وہ شوخ رنگ کی بشرٹ پہنے ہوئے بڑے بے ڈھنگے پن سے مسکرا رہا تھا۔ حیرت کی بات ہی تھی۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ پروفیسر ایسا زاہد خشک، لڑکیوں کے پیچھے سڑکوں پر سیٹیاں بجانے والے آوارہ گرد لڑکوں کی سی کبھی وضع قطع اختیار کر سکتا ہے میں نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ اپنا پروفیسر تو بڑا چھپا رستم نکلا۔ لیکن اس بات کا تعلق تو اس کی نجی زندگی سے تھا لہذا میں نے کمرے کے اندر جانا مناسب نہ سمجھا۔ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف چل دیا۔ اسی وقت پروفیسر نے ٹوک کر کہا۔

" ارے بھئی شبیر! تم آ گئے! کہاں چلے ادھر آؤ۔"

غالباً آئینے میں اس نے میرا عکس دیکھ لیا تھا۔ مجبوراً مجھ کو اس کے پاس جانا پڑا۔ اس کی بشرٹ کو میں نے قریب سے دیکھا تو بڑی ہنسی معلوم ہوئی اس پر جگہ جگہ خبروں کے تراشے تھے۔ کہیں ساحل سمندر پر کوئی دوشیزہ ریت پر لیٹی ہوئی اپنی ننگی ٹانگوں کی نمائش کر رہی تھی۔ کہیں کوئی نوجوان جوڑا بڑے شہوت انگیز انداز میں بوس وکنار میں محو تھا۔ اس بشرٹ کو پہن کر وہ اچھا خاصا جوکر نظر آ رہا تھا۔

پروفیسر میری نظروں کو بھانپ گیا تھا۔ کھسیانی ہنسی ہنس کر کہنے لگا۔

"وہ بے غیرت آج پھر آیا تھا۔" یہ ایاز کی جانب اشارہ تھا۔ اس کے لہجے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ رات کے واقعہ پر پروفیسر نے ایاز کو معاف کر دیا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"کون ؟"

اس دفعہ وہ کسی قدر بے تکلفی سے بولا۔

"وہی ایاز کا بچہ اور کون۔ ابھی ذرا دیر پہلے ہی تو یہاں سے گیا تھا اس کی اس بات پر میں جل گیا۔" عجیب سادہ لوح آدمی ہے کل رات اس کو جس شخص نے اس قدر پریشان کیا۔ آج وہ اس کا اس طرح تذکرہ کر رہا تھا گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ پروفیسر مجھ کو خاموش دیکھ کر کہنے لگا۔

"یہ سارا الم غلم سامان خرید کر وہی لایا ہے۔"

میں نے دیکھا، کمرے میں ایک طرف کئی شوخ رنگ کی ٹائیاں اور رومال سینٹ کی شیشیاں اور کئی اسی طرح کی لغتر پٹیں پڑی ہوئی تھیں جو اس وقت پروفیسر پہنے ہوئے تھا۔ سامان دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ اس پر سو سوا سو روپے ضرور خرچ ہوئے ہوں گے۔ اگر پروفیسر کو منانے کے لئے ایاز اتنی رقم خرچ کر سکتا ہے۔ تب تو پروفیسر کا اس طرح من جانا بے جا نہیں تھا۔ میں نے از راہ مذاق کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ایاز کو آپ کے ٹیسٹ کا بخوبی اندازہ ہے۔"

وہ شرمندہ ہو کر ہنس دیا۔ یہ نئی بات نہیں، وہ اکثر ایسی حرکتیں کیا

کرتا ہے۔ ایک تو یہ فضول سامان اٹھا لایا۔ اور اس پر یہ اصرار کہ اسے پہنو بھی۔ میرے سر ہو گیا۔ زبردستی یہ بشرٹ پہنوا کر گیا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ یہ بشرٹ مجھ پر کیسا لگے گی؟"

میں نے ان کے لہجے سے اندازہ لگایا کہ اس بیزاری میں بھی کہیں ان کے دل کا چور چھپا ہوا تھا۔ میں نے فوراً جواب دیا۔

"نہیں پروفیسر صاحب، سچ مچ یہ تو آپ پر کھل رہی ہے۔ بڑے اسمارٹ نظر آ رہے ہیں۔"

جھوٹ موٹ کی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا:۔

"اب تم مجھ کو بے وقوف بنانے کی کوشش تو کرو نہیں۔" میں اس کی بات کا جواب دینے ہی والا تھا کہ دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ شاید ایاز آیا ہے، پروفیسر گھبرا کر بولا۔

"دیکھو۔ وہ میری اسٹوڈنٹ عذرا آئی ہوگی۔ تم جا کر اس کو بٹھاؤ۔ میں ابھی کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں۔"

میں نے دروازے پر جا کر دیکھا۔ سانولے رنگ کی ایک شرمیلی سی لڑکی وہاں کھڑی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"آپ اندر آ جائیے۔ پروفیسر صاحب ابھی آتے ہیں۔"

میری بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اندر جا کر چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی۔ ذرا ہی دیر بعد پروفیسر بھی وہاں آ گیا۔ وہ کاؤ بوائز والی بشرٹ وہیں کمرے میں اتار آیا تھا۔

میں نے غور کیا کہ سانولے رنگ کی شرمیلی لڑکی عذرا، میرے سامنے پروفیسر سے بات کرتے ہوئے کچھ جھجک سی رہی تھی لہٰذا میں نے جلدی جلدی چائے کی پیالی ختم کی اور وہاں سے اُٹھ کر نیچے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

ذرا دیر بعد پروفیسر میرے کمرے میں گھبرایا ہوا آیا۔ "آج تم باہر گھومنے نہیں گئے"۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟ اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ باہر چلا گیا۔ لمحہ بھر بعد وہ پھر میرے کمرے میں آگیا اور آتے ہی وہی سوال کیا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اور اسی طرح گھبرایا ہوا میرے کمرے سے چلا گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد لکڑی کے زینے پر اس کے قدموں کی آواز اُبھری۔ ایک بار وہ پھر کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ لیکن اب کے اس نے کوئی بات نہیں کی اور کچھ ڈھونڈنے کے سے انداز میں نظریں گھما گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی اس گھبراہٹ نے مجھ کو بھی خواہ مخواہ پریشانی میں مُبتلا کر دیا۔ میں ابھی تک یہ طے نہیں کر سکا تھا کہ اس وقت اس سے بات کرنا مناسب بھی ہوگا۔ کہ نہیں، پھر وہ خود ہی بولا:۔

'تم سے ایک کام تھا"

"میں نے بڑی مستعدی سے جواب دیا "کہئے"

مگر وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ پھر سر کے بالوں کو کریدتے ہوئے بولا "تمہارے پاس اس وقت چالیس روپے تو نہیں ہوں گے" میں نے جلدی سے کہا۔

"جی ہاں ابھی حاضر کئے دیتا ہوں" میں نے اسی وقت روپے نکالے اور اس کے ہاتھ میں دے دیئے۔ روپے لیکر وہ کہنے لگا:۔

" پہلی تاریخ کو تم مجھ سے لے لیتا، اس وقت کچھ ایسی ہی ضرورت پیش آگئی تھی ۔۔۔"

مجھ کو اس نے بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا ۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے اپنا یہ جملہ پورا کیا تھا ۔ وہ تیز تیز قدموں سے زینے کے اوپر چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا تھا ۔ میں خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ پروفیسر اتنا گھبرایا ہوا کیوں تھا ۔ کئی اوٹ پٹانگ قسم کی باتیں میرے ذہن میں گھومنے لگیں اسی دوران میں پروفیسر اس لڑکی کے ساتھ ساتھ نیچے آیا ۔ وہ تو باہر چلی گئی البتہ وہ میرے پاس آگیا ۔ اب اس کے چہرے پر وہ گھبراہٹ نہ تھی بلکہ وہ کسی قدر بشاش نظر آرہا تھا ۔

کہنے لگا " بھئی تم نے اس وقت بہت بڑا کام کیا ہے ۔"

میں نے کہا آپ مجھ کو خواہ مخواہ شرمندہ کر رہے ہیں ۔"

وہ کہنے لگا " بھئی ! اس لڑکی کی ابھی تک فیس جمع نہیں ہو سکی ۔ فائنل ایر ہے بیچاری بے حد پریشان تھی اور اپنا حال یہ ہے کہ اس مہینہ ایاز نے کچھ قرض لے لیا تھا اس لئے اپنی جیبیں بالکل خالی ہیں ۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی فیس کے لئے روپیہ فراہم کردوں مگر تم نے ۔۔۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ۔

" دیکھئے پروفیسر صاحب آپ مجھ کو بار بار شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔"

وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا بات آئی گئی ہو گئی ۔

لیکن دوسرے ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں ہی مجھ کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ عذرا کے علاوہ اور بھی کئی طالب علم تھے جن کی وہ وقتاً فوقتاً مالی امداد کیا کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ اسی مد میں چلا جاتا تھا۔ اس کا ذاتی خرچ زیادہ نہیں تھا۔ بڑی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کو صرف ایک ہی شوق تھا اور وہ تھیں کتابیں۔ ہر مہینہ وہ کچھ کتابیں خرید کر ضرور لاتا۔ اسی طرح اس نے بڑی اچھی لائبریری بنا لی تھی۔ زیادہ تر وہ اسی کے اندر بیٹھ کر اپنا وقت گزارتا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ پروفیسر نے صبح ہی صبح الماری سے کتابیں نکال کر فرش پر جگہ جگہ انبار لگا دیئے تھے اور ان کو نئے ڈھنگ سے آراستہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اسی کام میں وہ اس قدر مصروف تھا کہ اس روز اس نے چائے بھی نہیں پی۔

دوپہر کو میں اس کے پاس گیا۔ مگر وہ کتابوں کی ترتیب میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اور کپڑے دھول سے لٹے ہوئے تھے۔ اس وضع قطع میں وہ بڑا ہونق سا نظر آ رہا تھا مگر اس کو بات کا ہوش نہیں تھا۔ مجھ کو دیکھ کر اس نے کچھ بات کرنا چاہی مگر اسی وقت اس کی نظر ایک بوسیدہ سی کتاب پر پڑ گئی۔ وہ اس کو اٹھا کر ورق الٹنے پلٹنے لگا۔ ایک جگہ حاشیے پر کوئی عبارت درج تھی۔ وہ اس کو نظر گڑا گڑا کر پڑھنے میں کچھ ایسا محو ہو گیا کہ میری موجودگی کا احساس ہی اس کے ذہن سے نکل گیا۔ میں کئی منٹ تک خاموش کھڑا رہا مگر اس نے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں۔ میں اپنی

موجودگی کو مداخلت بے جا سمجھتے ہوئے کمرے میں واپس آگیا۔ اور بستر پر لیٹ کر سو رہا۔

شام سے کچھ دیر پہلے میں پھر اس کے پاس گیا۔ اس وقت وہ ساری کتابیں قرینہ سے آراستہ کر چکا تھا۔ اس وقت وہ بڑا مسرور نظر آرہا تھا۔ بلاشبہ اس نے کتابوں کی ترتیب میں بڑی نفاست سے کام لیا تھا دن بھر کام کرتے کرتے اب وہ بے حد تھک چکا تھا میں نے سوچا تھا۔ کہ ذرا دیر اس سے بات کر لوں گا۔ مگر اس طرح بھی اس کا موقع نہیں مل سکا۔ کوئی پروگرام نہ تھا اس لئے میں وہاں سے اٹھ کر سینما چل دیا۔

پہلے شو میں بڑا رش تھا۔ اس لئے ٹکٹ نہیں مل سکا لیکن سینما دیکھنے کا اس دن چونکہ پروگرام بنا چکا تھا لہذا دوسرا شو دیکھا۔ رات کو کوئی بارہ بجے کے قریب گھر پہنچا۔ اوپر کی منزل میں ابھی روشنی ہو رہی تھی۔ پروفیسر ابھی تک جاگ رہا تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ روشنی لائبریری میں ہو رہی تھی۔ میں اسی طرف چل دیا مگر دروازے پر پہنچ کر میری چیخ نکلتے رہ گئی۔

سامنے فرش پر ہر طرف کتابیں پھیلی ہوئی تھی۔ بعض کتابیں پھٹ گئی تھیں۔ ان کے اوراق بکھرے پڑے تھے۔ الماریاں گر گئی تھیں۔ ان کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ لائبریری کے مختصر سے آتشدان میں ابھی تک کتابیں جل رہی تھیں۔ کبھی ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتا تو شعلے بھڑک اٹھتے۔ میں وحشت ناک حالت سے یہ سب کچھ کھڑا دیکھتا رہا۔

ایک گری ہوئی الماری سے ٹیک لگائے بکھری ہوئی کتابوں کے درمیان، پروفیسر فرش پر گم سم بیٹھا تھا۔ لمحہ بھر کو میری نظریں اس کی

نظروں سے ہٹ گئیں ۔ اس کی آنکھوں میں بلا کا کرب تھا کہ میں تاب نہ لا سکا۔ خود بخود میری نگاہیں جھک گئیں۔

کئی لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ پھر کمرے کے گہرے سکوت میں پروفیسر کی آواز ابھری۔

”کب آئے تم ؟“ اس کے لہجے میں سسکیوں کا سا درد تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ اس وقت وہ بہت بوڑھا نظر آرہا تھا۔ مجھ کو خاموش دیکھ کر اس نے پھر کہا۔

”تم اتنے پریشان کیوں —— “ وہ زبردستی مسکرانے کی کوشش کرنے لگا ”میں ان کو پھر درست کر لوں گا۔“

میں نے پوچھا ”یہ آپ کو کیا سوجھی ؟ کتنی تندہی سے تو آپ نے لائبریری کو آج دن بھر آراستہ کیا تھا“ میری اس بات پر وہ ذرا کھل کر مسکرایا۔ پھر اس نے بڑا بے تکا سا سوال کیا۔

”تمہارا نام شبیر احمد ہے نا ؟“

میں نے جواب دیا ”جی ہاں۔“

اس کا دوسرا سوال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

پوچھنے لگا ”تم داکر اینڈ داکر میں سپروائزر بھی ہو ؟“ میں نے اس دفعہ بھی اس کی بات کا صحیح مفہوم سمجھے بغیر کہہ دیا ”جی ہاں۔“

”اور اس وقت تم میری لائبریری میں کھڑے ہو ؟“ پھر وہ بے تکا سوال میں نے رٹے ہوئے سبق کی طرح پھر کہہ دیا ”جی ہاں۔“

لیکن اس کے کسی اور بے تکے سوال سے قبل ہی میں نے گھبرا کر پوچھا۔

' ان سوالوں سے آخر آپ کا مطلب کیا ہے ؟"

وہ بڑے اطمینان سے بولا ۔" اسکا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں ۔ اور جب میں ہوش و حواس میں ہوں تو پھر لائبریری کا یہ حلیہ کیسے بنا سکتا ہوں ؟" میں نے کہا۔

' یہی تو میں سوچ رہا ہوں ۔"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور آتشدان میں سلگتی ہوئی ایک کتاب کو دیکھنے لگا جس کی جلد پھٹ کر دو حصوں میں پھیل گئی تھی۔ کمرے کے اندر دیر تک خاموشی رہی آتشدان میں انگارے دہکتے رہے۔ دریچہ سے کبھی کبھار ہوا کا کوئی تیز جھونکا آجاتا تو شعلے بھڑک اٹھتے ۔ اور فرش پر بکھرے ہوئے اوراق کھڑکھڑانے لگتے ۔ ایک بار پھر اس نے مڑ کر میری جانب دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا ۔ اسی عالم میں وہ کہنے لگا ۔

' تم اس سارے ہنگامے کی وجہ معلوم کرنے کے لئے بڑے بے چین ہو رہے ہو ۔ بھئی بات صرف اتنی سی ہے کہ شام کو تمہارے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد عذرا آ گئی تھی ۔ اس کو دو کتابوں کی تلاش تھی اتفاق سے دونوں ہی کتابیں میرے پاس نکل آئیں ۔ میں اس سے ان کتابوں کے موضوع پر بات کر رہا تھا کہ اتنے میں ایاز آ گیا ۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا ۔ پیشانی پر بل پڑے ہوئے

تھے۔ میں نے اس کو بھی وہیں بٹھا لیا۔ مگر وہ روٹھا ہوا منہ پھیلائے خاموش بیٹھا رہا۔ میں اس کی ناراضگی کی وجہ سمجھ گیا تھا۔ اس اتوار کو اس نے پکنک کا پروگرام بنایا تھا۔ مجھ کو بڑے اصرار سے بلایا گیا تھا لیکن میں کتابوں کی ترتیب میں ایسا پھنسا کہ کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا لہذا میں نے عذرا کی موجودگی میں ہی اس سے معذرت کرتے ہوئے ساری بات بتا دی تھی۔ اس نے میری باتوں کو خاموشی سے سنا۔ کسی قسم کا اظہار خیال نہیں۔ بت کی طرح چپ بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد اٹھ کر لائبریری میں چلا گیا اور یہاں آکر اس نے جو کچھ کیا وہ تمہارے سامنے موجود ہے۔"

میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "آپ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔"

وہ کہنے لگا۔ "اگر میں اس کو روکتا نہیں تو شاید آج اس نے ساری لائبریری ہی پھونک ڈالی ہوتی۔ وہ ہوا یہ کہ اس کے لائبریری میں جانے کے کچھ ہی دیر بعد میں نے کتابیں گرنے کی آواز سنی تھی۔ لیکن جب ایک الماری شور مچاتی ہوئی فرش پر آ گئی تو میں گھبرا کر وہاں پہنچا مگر دروازہ اندر سے بند تھا اور لائبریری میں کتابوں کے پھٹنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں الماریاں دھڑا دھڑ گر رہی تھیں۔ شیشے ٹوٹ رہے تھے۔ اس وقت تک عذرا میرے ساتھ ہی تھی بلکہ مجھکو اچھی طرح یاد ہے کہ ونٹیلیٹر کے راستے اندر جانے کی ترکیب بھی اسی نے بتائی تھی۔ بڑی مشکل سے میں اندر پہنچا۔ یہ دیکھو گھٹنے پر سے پتلون بھی پھٹ گئی۔ بازو الگ چھل گیا۔

وہ مجھ کو اپنی پھٹی ہوئی پتلون اور زخمی بازو دکھلانے لگا۔ میں نے اس کی تکلیف سے متاثر ہوئے بغیر جل کر پوچھا۔

"آخر اتنی سی بات پر ایاز اس قدر دیوانہ کیوں بن گیا۔

وہ بڑے نرم لہجے میں بولا "تم اس سے ملے نہیں۔ وہ بڑا سرپھرا نوجوان ہے۔ اس لائبریری سے تو اس کو ہمیشہ سے بیر ہے۔ وہ تو اس کو قبرستان کہا کرتا ہے اس کا تو قول ہے کہ کتابیں انسانی فکر کی قبریں ہیں زندگی کتابوں سے بھرے ہوئے اس کمرے میں نہیں ہے۔ زندگی کوچہ و بازار میں ہے، شراب خانوں اور رقص گاہوں میں ہے۔ اپنی اس بات کو منوانے کے لئے وہ اکثر مجھ سے الجھ پڑتا ہے۔ آج جو اس نے پروگرام بنایا تھا۔ اس میں کچھ بے فکرے نوجوان اور فلرٹ ٹائپ کی تیز و طرار لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ تمام دن ساحل سمندر پر بیئر پی کر گانے ناچنے، پانی میں اچھل کود کرنے اور ایسے ہی ہنگامے بپا کرنے کا پروگرام تھا۔ اب تم ہی بتاؤ میں ان لوگوں کے ساتھ اس اودھم میں کیا اچھا معلوم ہوتا۔ میں نے اس کو سمجھایا بھی مگر وہ برابر یہی کہتا رہا کہ تم خواہ مخواہ اپنے آپ کو بڈھا سمجھنے لگے ہو۔ میں نے تو ساٹھ ساٹھ سال کے عمر انگریزوں کو ایسے موقعوں پر عام طور سے دیکھا ہے۔"

وہ اپنی بات کہہ چکے تو میں غور کرنے لگا کہ تمام برائیوں کے باوجود ایک بات ضرور ہے وہ یہ کہ ایاز واقعی پروفیسر سے بڑا خلوص رکھتا ہے۔ اس نے یہ جو کچھ کیا وہ صرف اس کی ہمدردی میں کیا تھا۔ یہ بات، دوسری ہے کہ

کبھی کبھی ہمدردی بڑی مہنگی بھی پڑ جاتی ہے ۔ ایاز کی جانب سے جو مجھ کو غصہ تھا وہ اب کم ہو چکا تھا لیکن پروفیسر نے اس کو ابھی تک معاف نہیں کیا تھا ۔ اس بات کا اندازہ میں نے اس طرح لگایا کہ ایک پھٹی ہوئی کتاب کے ورق سمیٹتے ہوئے اس نے بڑے طیش کے عالم میں کہا تھا ۔

"شہیر" میں نے یہ کتاب، پندرہ سال پہلے خریدی تھی ۔ اس الو کے پٹھے نے اسی کو پھاڑ تو ڈالی مگر اس کو کیا خبر کہ اس کتاب کو خریدنے کے لیے، میں نے اپنے دوست کی گھڑی چرائی تھی ۔ رات بھر حوالات میں رہنا پڑا تھا ۔ وہ بڑا جذباتی ہوتا جا رہا تھا ۔ "کسی کو کیا خبر کہ ان کتابوں کے ساتھ میری زندگی کی دردناک یادیں وابستہ ہیں ۔"

دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا ۔ بڑی مشکل سے میں نے اس کو وہاں سے اٹھا کر بستر پر پہنچایا ۔ ورنہ وہ ساری رات وہیں گزار دیتا پتہ نہیں، میرے واپس آنے کے بعد وہ پھر وہاں پہنچ گیا ہوگا ۔

اس واقعہ کو اب ہفتہ بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا ۔ پروفیسر سے اکثر ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں ۔ مگر اس نے بھول کر بھی ایاز کا تذکرہ نہیں کیا ۔ میں نے ایک بار چھیڑ کر ایاز کے متعلق پوچھا بھی تو وہ نظر انداز کر گئے ۔ میں نے دیکھا کہ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے ۔ اور چہرہ تمتما اٹھا ۔ اس ایاز نے واقعی اس کو بہت سخت صدمہ پہنچایا تھا ۔

انہی دنوں کا ذکر ہے ۔ ایک روز رات کے وقت پروفیسر اکثر خلاف

معمول دیر سے واپس آیا۔ میرے کمرے کے اندر آکر کہنے لگا " بھئی معاف کرنا میں نے تم کو ڈسٹرب تو نہیں کیا " اس قسم کے تکلفات وہ اکثر کیا کرتا تھا حالانکہ وہ اس وقت بڑے اچھے موڈ میں معلوم ہو رہا تھا۔ چہرے پر تازگی تھی اور لہجے میں ایک خاص طرح کی تیزی تھی۔ میں نے جواب دیا۔

" ہرگز نہیں۔ مگر آج آپ کو اتنی دیر کہاں ہو گئی "

وہ بے ساختہ ہنسنے لگا۔ " ارے بھئی کچھ پوچھو نہیں۔ اس نامعقول سے راستے میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ نہ جانے وہ کہاں سے بڑی شاندار کار لے آیا تھا۔ ساتھ میں لڑکیوں کی پوری پلٹن تھی۔ کم بخت ان میں راجہ اندر بنا بیٹھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب کو چھوڑ چھاڑ کر میرے پاس آگیا اتنی بات ضرور ہے کہ وہ میری عزت اب بھی اسی طرح کرتا ہے۔ ذرا دیر تک تو ہم دونوں چہل قدمی کرتے رہے۔ پھر وہ مجھ کو اپنے ساتھ زبردستی کلب لے گیا۔ بھئی یوں تو وہ کمال کا کھیلتا ہے۔ یہ مجھ کو آج پتہ چلا۔

ذہین اس بلا کا ہے کہ آج تو سارے لوگ دنگ رہ گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ بھاری بھر کم جسم کا آدمی خوب جیت رہا تھا۔ کارڈ اس کو بڑا فیور کر رہا تھا۔ ایک بار کارڈ ڈیل ہونے سے پہلے ایاز کو ایکا ایکی جانے کیا سوجھی ہے کہ کھڑے ہو کر تاشوں کی گڈی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس میں سے چار تاش نکال کر جیب میں ڈال لئے اور بازیگروں کی طرح لوگوں سے کہنے لگا۔ دیکھئے میں ابھی اپنے جادو منتر کے زور سے یہ کارڈ آپ کی جیب سے نکالتا ہوں اور اس نے اس بھاری بھر کم جسم والے آدمی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر

چاروں کارڈ نکال کر دکھا دیئے۔ آج تک کسی نے شار پر اس کو اس طرح نہ پکڑا ہوگا۔ وہ اس بات پر بگڑا تو ایاز نے اس کی کلائی پکڑ کر وہ مکا تمایا کہ کرسی سمیت فرش پر آ رہا۔ پھر تو سب ہی اس پر ٹوٹ پڑے وہ مرمت ہوئی کہ بس کچھ نہ پوچھو — شاید ان کی نظر میں وہ پورا منظر آ گیا تھا۔ وہ برابر ہنستے جا رہے تھے۔ میں نے اس کو اس فراخدلی سے ہنستے بہت کم دیکھا تھا ــــ"

رات اب زیادہ ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ تھوڑی دیر بعد اوپر چلا گیا۔ اب پھر ایاز کا ذکر شروع ہو گیا تھا۔ کوئی بات ہوتی کسی کا تذکرہ ہوتا وہ خواہ مخواہ گفتگو میں ایاز کو ضرور لے آتا۔ اکثر تو مجھے اس کے اس انداز پر جھنجھلاہٹ سی معلوم ہوتی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں اپنا سوٹ پہن کر کہیں جا رہا تھا کہ دروازے پر پروفیسر مل گیا۔ کہنے لگا:-

"سوٹ تو تم نے بڑا شاندار سلوایا ہے۔ کپڑا بھی قیمتی معلوم ہوتا ہے پھر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے بولے "لیکن کمر کے پاس کچھ جھول آ گیا ہے اس عیب نے وقعت گھٹا دی۔ اسی کپڑے کا میں نے ایاز کے پاس بھی سوٹ دیکھا ہے۔ نہ جانے کس درزی سے سلوایا ہے۔ بڑی عمدہ فٹنگ ہے۔ اس کا جسم بھی خوبصورت ہے۔ پہن کر چلتا ہے تو بالکل کلارک گیبل معلوم ہوتا ہے"

"ایاز میں لاکھوں خوبیاں سہی مگر اس وقت اس کے ذکر کا موقع نہیں تھا۔ اسی طرح ایک روز میں بڑا نفیس سا سینٹ لے کر آیا۔ اس کی

مہک کی دیر تک تعریف کرتا رہا۔ پھر نہ جانے اس کو کیسے خیال آ گیا۔ کہنے لگا
"لیکن ایاز کے پاس جو میں نے سینٹ دیکھے ہیں ان کی مہک سے روح پر وجد
طاری ہو جاتا ہے۔ خوشبوؤں کے انتخاب میں اس نے بڑا نفاست پسند
ٹیسٹ پایا ہے۔"

اس دفعہ بھی میں غصہ پی گیا۔ البتہ اس روز تو میں ان کے ریمارک سے
بے حد جھلا گیا تھا جب انہوں نے خواہ مخواہ ایاز کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ بات
صرف اتنی تھی کہ والدہ نے خط کے ساتھ ایک لڑکی کی تصویر بھیجی تھی۔ اس کے
ساتھ وہ میری نسبت طے کر رہی تھیں۔ وہ لڑکی صورت شکل کی جیسی
بھی ہو مگر فوٹو اس قدر غضب کا تھا کہ دیکھ کر آدمی خود تصویر بن جاتا تھا۔
شامت اعمال میں نے وہ تصویر پروفیسر کو بھی دکھا دی۔ ذرا دیر تک
وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر بولا:۔

"بہت خوب" ذرا دیر وہ اس کو محویت کے ساتھ دیکھنے کے بعد
کہنے لگا: "تمہارے لیے اس کا انتخاب کیا گیا ہے۔ بڑی حسین لڑکی
ہے۔ کہیں ایاز کے ساتھ اس کا رشتہ ہو جائے تو دونوں کا مثالی
جوڑا ہو جائے گا۔"

کہنے کو تو وہ یہ بات کہہ گیا۔ جہاندیدہ آدمی تھا۔ فوراً ہی اس کو اپنی
غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ میں اس وقت واقعی
غیظ کے عالم میں تھا۔ معذرت کرنے کے انداز میں کہنے لگا۔

"بھئی برا نہ ماننا۔ میں نے یوں ہی یہ بات کہہ دی تھی" اس کے بعد

اس لڑکی کے حسن کی تعریف دیر تک کرتا رہا۔ مگر اس کی بات میرے دل کو ایسی لگی تھی کہ ان باتوں سے اس کا اثر کم نہ ہوا۔ غصہ تو اب کم ہو گیا تھا۔ البتہ میں اس وقت بے حد اداس ہو گیا تھا۔ مجھ کو پریشان دیکھ کر کہنے لگا۔ تم تو واقعی برا مان گئے۔ بڑے جذباتی ہو۔ اچھا آؤ، میں تم کو بڑی دلچسپ چیز دکھاؤں۔"

میرا اس کے ساتھ جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا مگر وہ اصرار کر کے اپنی خواب گاہ تک لے گیا۔ پھر اس نے اپنے سرہانے، دیوار پر لگے ہوئے مجسمے کو دکھلایا۔ نہ جانے وہ کس پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اس کے اندر بجلی کا ایک بلب روشن تھا۔ وہ دیوار گیری کی طرح دیوار میں آویزاں تھا۔ مجسمہ میں سے سبزی مائل نیلی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ یہ ایک عورت کا مجسمہ تھا۔ وہ رقص کے انداز میں کھڑی تھی۔ کچھ اس طرح کہ اس میں جھجک بھی تھی۔ اور خود سپردگی بھی۔ اس کے بدن کا ایک ایک خم ایک ایک پیچ نکھر گیا تھا۔ سنگ تراش نے اس فٹ بھر کے مجسمہ میں صناعی کا کمال دکھایا تھا۔ میں دیر تک اس کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پروفیسر مجھ کو اس عالم میں دیکھ کر مسکرایا۔

"تم تو اس سے مسحور ہو کر رہ گئے۔ یہ میرے ایک دوست ابھی چند روز ہوئے روم سے لائے تھے۔ بھئی اطالوی سنگ تراشی کی کیا بات ہے۔ میں نے اب تک تم کو اس لیے نہیں دکھایا تھا کہ تم اس کو میرے کمرے میں دیکھ کر نہ جانے کیا سوچو گے۔"

نہ جانے کیوں اس کو اپنے بوڑھے ہونے کا اس قدر احساس تھا۔ بہرحال ہم دونوں کوئی گھنٹہ بھر تک صرف اس مجسمے کے موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ سنگ تراشی پر بات چلی تو اس نے اس فن پر اس انداز سے گفتگو کی کہ میں کے مطالعہ سے ششدر رہ گیا۔

لیکن اس کی فطرت کا نہ جانے یہ کون سا پہلو تھا کہ جب اس کا موڈ ہوتا تو کسی بھی موضوع پر بے تکان باتیں کرتا رہتا ورنہ کوئی سوال بھی پوچھا جاتا تو وہ اس طرح خاموش بیٹھا رہتا جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔ یہی بات اس مجسمے کے سلسلے میں بھی ہوئی۔ دوسرے دن میں نے اس کا ذکر کیا تو وہ چند جملے کہہ کر خاموش ہو گیا۔ مگر اس مجسمے سے میں اس قدر متاثر ہوا تھا کہ میں نے چھیڑ کر پھر اس کا ذکر نکالا۔ وہ اس کو ٹالنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اصرار کیا تو جھنجھلا کر میرے پاس سے اٹھ کر لائبریری میں چلا گیا۔ جب کبھی وہ کسی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہوتا تھا تو ہمیشہ لائبریری میں جا کر پناہ لیتا تھا۔

دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے۔ میں رات کو دیر سے لوٹا۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ دن بھر میں پروفیسر نہیں مل سکا تھا۔ اوپر کی منزل میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا ابھی نیند تو آئے گی نہیں، ذرا پروفیسر کے ساتھ ہی وقت گذر جائے تو اچھا ہے کچھ یہی سوچ کر میں اس کے کمرے میں گیا۔ وہ بجائے صوفے کے گلدان رکھنے کے اونچے سے اسٹول پر مور کی طرح سکڑا سکڑایا بیٹھا تھا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ ماتھے

پر سے خون بہہ کر رخسار پر آ کر جم گیا تھا بدن پر اور بھی کئی جگہ خراشیں معلوم ہوتی تھیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ آج پھر یہاں کچھ نہ کچھ ہنگامہ برپا ہوا ہے۔

وہ کچھ اس طرح سے بُت بنا بیٹھا تھا کہ کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ ایک دفعہ اس نے مجھ کو دیکھا بھی مگر چپ بیٹھا رہا۔ میں بھی خاموش کھڑا رہا۔ آخر اُس نے خود ہی کہا۔

"کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔

"آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔"

پروفیسر نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کھوئی کھوئی نظروں سے مجھ کو دیکھتا رہا۔ ذرا بعد وہ اسٹول سے اتر کر نیچے آ گیا۔ پھر اس نے مجھ کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھ کو لیئے ہوئے خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ دروازے پر پہنچ کر میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ سامنے مجسمے کے ٹکڑے پڑے تھے۔ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔

"ایاز ۔۔۔!" پھر میں نے جلدی سے پوچھا "کیا وہ آیا تھا؟"

"ہاں" جواب میں اس نے صرف ایک لفظ کہا۔

میں نے غصے سے تقریباً چیخ کر کہا "آخر وہ چاہتا کیا ہے؟"

"وہ کہتا ہے کہ جو لوگ پتھر کے مجسموں میں اپنی تسکین کا سامان ڈھونڈتے ہیں وہ پتھر کی طرح سرد پڑ جاتے ہیں۔ یہ موت کی علامت ہے وہ مجھ کو موت کے منہ میں جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے اس نے

مجسمہ توڑ دیا۔ میں نے اسکو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی وحشیوں کی طرح مجھ سے الجھ گیا۔ بالکل پاگلوں کی حرکتیں کر رہا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر ادا کر رہا تھا۔ مجھ کو اس کا یہ انداز بیحد ناگوار گزرا۔ میں نے جل کر کہا: "اس الّو کے پٹھے کو آپ نے خواہ مخواہ سر چڑھا لیا ہے۔"

میری بات پر بُرا ماننے کے بجائے وہ بے نیازی سے مسکرا کر بولا۔ "تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔"

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر ایکا ایکی اس کو نہ جانے کیا خیال آیا۔ کہ وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ اس کو دلاسہ دے کر چپ کرا دوں مگر اس وقت اس کا رو لینا ہی اس کے حق میں مناسب تھا۔ وہ دُکھ جو بہت دیر سے اپنے سینے میں دبائے بیٹھا تھا۔ وہ آنسوؤں کے ذریعے تحلیل ہو کر نکل رہا تھا۔

کمرے کے گہرے سکوت میں اس کی سسکیاں دیر تک ابھرتی رہیں۔ سامنے فرش پر اس مجسمہ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ جس کے وجود میں ایک حسینہ کے جسم کا لوچ تھا۔ پیچ و خم تھے، جو اطالوی سنگ تراشی کا ایک نادر نمونہ تھا۔ پروفیسر کا چہرہ مردے کی طرح خاکستری ہو گیا تھا۔ رُخساروں کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔ اسی اثناء میں پروفیسر پر کھانسی

کا دورہ پڑا اس نے اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیا اور بوڑھوں کی طرح کھانسنے لگا۔

کھانسی سے جب وہ ذرا سنبھلا تو مجھ سے کہنے لگا " تم مجھ کو اس وقت تنہا چھوڑ دو، میں تمہارا بہت ممنون ہوں گا " یہ بات اس نے کچھ ایسے لہجے میں کہی تھی کہ میرے لئے اب وہاں ٹھہرنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔

میں چپ چاپ نیچے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ مگر بے چینی میں نیند نہ آسکی۔ اوپر پروفیسر کے کمرے سے برابر کھانسی کی آواز آرہی تھی۔ پتہ نہیں رات میں وہ کسی لمحہ سویا بھی یا ساری رات آنکھوں میں ہی کاٹ دی۔

اب تک میں نے ایاز کا اس قدر بے چینی سے انتظار نہیں کیا تھا، مگر اس رات کے واقعہ کے بعد سے تو بس ہر وقت یہی دھن ہے کہ کسی طرح وہ مل جائے تو اس کو دھکے دے کر اس قدر ذلیل کرکے نکالوں کہ وہ دوبارہ اس طرف کا رُخ نہ کرے۔ اسی ارادے کے تحت میں نے دفتر سے ہفتہ بھر کی چھٹی لے لی اور گھر سے نکلنا بھی بند کر دیا۔ ہر وقت بیٹھا بس ایاز ہی کی راہ تکتا رہا۔ لیکن وہ بھول کر بھی اس طرف نہ آیا۔ پروفیسر کو تو بات نہیں بتائی مگر اس کی اتنی طویل غیر حاضری سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ اس روز رات کو دونوں میں بڑا سخت جھگڑا ہوا تھا۔

پروفیسر سے بھی ان دنوں کم ملاقات ہوتی تھی۔ اس کا بوڑھا ملازم

اچانک بیمار پڑ گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے ٹائیفائیڈ بتایا تھا۔ پروفیسر خود ہی اس کو دوا پلاتا تھا اپنے ہاتھ سے اس کے لئے دودھ گرم کرتا۔ دوائیوں کا آج کل قحط ہے۔ دن دن بھر اس کے لئے دوائیاں ڈھونڈتا پھرتا۔ رات کو سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دباتا۔ نیند سے اٹھ اٹھ کر اس کو پانی پلاتا لیکن ملازم کی بیماری میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ لہذا ڈاکٹروں کے مشورے پر وہ اس کو اسپتال لے گیا۔ لیکن روزانہ سہ پہر کو اس کے پاس بلاناغہ جاتا۔ کوئی مہینہ بھر بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی۔

جس روز ملازم کو اسپتال سے مکان پر لے کر آیا اس روز اس کے چہرے پر بڑی اچھوتی چمک تھی، ایسی تازگی جو شبنم سے بھیگ کر پتیوں پر آجاتی ہے۔ بڑھا ملازم تو اب صحت یاب ہو گیا تھا۔ مگر اس کی بیماری پر نہ صرف ہم دونوں کی تنخواہیں صرف ہو گئی تھیں بلکہ کچھ قرض بھی چڑھ گیا تھا اور یہ قرض خواہ اکثر آکر پریشان کیا کرتے تھے۔

اور لوگوں کو اس نے آئندہ ماہ پر ٹال دیا تھا مگر جس دوکاندار کے یہاں سے راشن آتا تھا وہ روزانہ کسی نہ کسی وقت بلائے بے درماں کی طرح نازل ہو جاتا تھا۔

بڑی سرد رات تھی۔ یہی کوئی ساڑھے نو کا عمل ہوگا۔ لیکن سردی زیادہ تھی۔ اس لئے سر شام ہی ہر طرف سناٹا پڑ گیا تھا۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی ہم دونوں کمرے کی تمام کھڑکیاں بند کر کے آتش دان کے سامنے بیٹھے کافی پیتے جا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ پروفیسر بڑے ہلکے پھلکے

موڈ میں تھا۔ وہ اس وقت یونانی دیو مالا کے متعلق بڑی اچھی باتیں بتا رہا تھا۔ اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔ سردی میں آگ کے پاس سے دروازے تک جانا بڑا برا معلوم ہوا مگر میں یہ سوچ کر کھڑا ہو گیا کہ کہیں اس وقت ایاز نہ آیا ہو۔ دروازہ کھول کر دیکھا۔ اندر اندھیرے میں کوئی خاموش کھڑا تھا۔ لیکن یہ تو وہی بلائے جاں تھی۔ وہ ایک دم سے کمرے کے اندر آگیا۔ اور سیدھا پروفیسر کے پاس پہنچ گیا۔

"دیکھئے صاحب! آج ہمارا حساب صاف ہو جانا چاہیئے۔"

پروفیسر نے حسبِ معمول نرمی سے کہا۔

"بھئی راشن تو تمہارے یہاں سے ہی آرہا ہے۔ آئندہ مہینے اکٹھا حساب صاف کر دیں گے۔"

وہ بڑے روکھے پن سے بولا۔

"نہیں صاحب اس طرح کام نہیں چلے گا۔ مجھ کو تو ابھی روپے کی ضرورت ہے۔"

پروفیسر نے بڑے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "شیخ جی ایسی بات مت کہو۔ اس مہینہ تم کسی طرح اپنا کام چلا لو۔ دوسرے مہینے جی چاہے تو تم مجھ سے کچھ زیادہ لے لینا۔"

وہ بڑی بدتمیزی سے بولا:-

"اجی زیادہ تو آپ کیا دیں گے۔ جو کچھ نکلتا ہے وہی مل جائے تو بہت ہے۔"

پروفیسر بھی اب بے قابو ہوا جا رہا تھا ۔ "خیر اس مہینہ تو تم کو کچھ نہیں مِل سکے گا ۔"

وہ آنکھیں نکال کر تقریباً چیخ کر کہنے لگا ۔ "ملے گا کیسے نہیں میں آج ہی سارا حساب لے کے جاؤں گا اور ابھی ۔"

اِتنا کہہ کر وہ آستین چڑھا کر کھڑا ہو گیا ۔ بات بڑھ جاتی اس لئے کہ پروفیسر کا چہرہ بھی سُرخ ہو گیا تھا ۔ میں جانتا تھا کہ اس کو کبھی غصّہ آتا ہی نہیں ۔ اور جب آتا ہے تو وہ بے حد خطرناک ہو جاتا ہے ۔ لہٰذا میں نے بیچ میں پڑ کر کہا :۔

"شیخ ! تم کو اپنا روپیہ چاہئے ہے نا ۔"

وہ ذرا نرم ہو کر بولا ۔ "جی ہاں ۔"

میں نے کہا ۔ "ایک گھنٹہ بعد آ کر مجھ سے اپنا پُورا حساب لیجانا ۔"

وہ ایک دم رضامندی پر مائل ہو گیا ۔ "بہت اچھی بات ہے ۔ میں دس بجے تک آجاؤں گا ۔"

اِتنا کہہ کر وہ چلا گیا ۔ اس کے جانے کے بعد پروفیسر نے مجھے بڑی قہر آلود نظروں سے دیکھا ۔

"تم اس کمینہ کی گیدڑ بھبکی سے ڈر گئے ذرا تم رک تو جاتے ، میں اس بدتمیزی کو وہ مزہ چکھاتا کہ زندگی بھر یاد رکھتا ۔" وہ بڑے جلال میں بول رہا تھا ۔ میں نے اس کے ہڈیاں نکلے ہوئے جسم کو دیکھا اور پھر اس کے مقابلے میں شیخ جی کے تنومند جسم کو دیکھا ۔ تو ہونٹوں پر ہنسی آتے

آتے رہ گئی میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا: "اس سے جھگڑا کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔"

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ کہنے لگا: "یہی سوچ کر تو میں چپ رہا ورنہ یہ مت سمجھنا کہ میں دبلا پتلا ہوں۔ ایک مکا مارتا تو مرے ہوئے بیل کی طرح فرش پر۔"

باتوں پر وقت صرف کرنے کا موقع نہیں تھا لہذا میں نے نیچے جاکر کپڑے تبدیل کئے اور اس جاڑے پالے میں ایک دوست کے یہاں پہنچا۔ ان کو اسی وقت جگاکر روپے قرض لئے اور گھر کی طرف چل دیا۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پروفیسر، جس کو میں جلے کباب کی طرح غصّہ کے عالم میں چھوڑ گیا تھا۔ بڑے معنی خیز انداز میں بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم نے تھوڑی دیر کر دی۔ ذرا دیر پہلے آئے ہوتے تو تماشا دیکھتے۔ وہ الّو کا پٹھا شیخ جی دس بجے سے پہلے ہی نازل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایاز بھی آگیا۔ آتے ہی اس نے اسی بدتمیزی سے تقاضہ کیا۔ تم کو بھی برا بھلا کہنے لگا ــــ" میں اس سے جلا تو بیٹھا ہی تھا مجھ کو بھی تاؤ آگیا مگر ایاز نے مجھ کو تو ایک طرف کر دیا۔ اس کے منہ پر دو تین مکے جو رسید کئے تو سارا طنطنہ بھول گیا۔ لگا عیں عیں کرنے۔ ایاز اس کو دروازے تک دھکے دیتا لے گیا۔ اور نکال باہر کیا۔ شریف ہوگا تو اب کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔"

میں خاموشی سے بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا وہ دیر تک اس ہنگامے

کی ایک ایک تفصیل بتاتا رہا۔ گیارہ بجے کے قریب میں اپنے کمرے میں آگیا۔ کپڑے تبدیل کرتے ہوئے اچانک مجھ کو خیال آگیا کہ اس وقت تو ایاز نے شیخ جی کو مار پیٹ کے نکال دیا ہے مگر وہ آدمی بدمعاش قسم کا معلوم ہوتا ہے کالج جاتے ہوئے راستہ میں اگر اس نے پروفیسر کے خلاف انتقاماً کوئی کارروائی کی تو یہ بہت بُرا ہوگا۔ . . . . . وہ باز نہیں آئے گا۔ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔ یہ سوچ کر میں فوراً شیخ جی کی طرف چل دیا۔ وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ نکل کر باہر آیا۔ میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ ابھی آپ گھر گئے تھے۔ مجھ کو ذرا دیر ہوگئی۔ آپ کے ساتھ ایاز نے جو حرکت کی ہے وہ بہت بُری بات ہوئی۔ مجھے اس کا بڑا افسوس ہے!"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ کون ایاز؟ کس کا جھگڑا؟ میں وہاں گیا ہی کب تھا۔ پروفیسر صاحب خود یہاں آئے تھے اپنی گھڑی دے گئے ہیں اور یہ کہہ گئے ہیں کہ چند ہی روز میں روپے کا بندوبست کرکے گھڑی لے جائیں گے۔ وہ تو بیچارے کتنی دیر تک خوشامد کرتے رہے اور آپ جھگڑے کی بات کر رہے ہیں" وہ ایک سانس میں ساری باتیں کہہ گیا اور میں سکتہ کے عالم میں بُت بنا اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر میں نے جیب سے روپے نکالے اور اس کو سمجھانے لگا۔

"بھئی ان کے ملازم نے تو مجھ سے یہی کہا تھا" میں نے پروفیسر کا تو

نام لیا ہی نہیں ، سارا الزام نوکر پر رکھ دیا۔" بہرحال آپ یہ روپے رکھ لیجئے اور کل گھڑی پروفیسر کو واپس دے دیجئے گا۔ میرے یہاں آنے اور روپے ملنے کا ان سے کوئی تذکرہ نہ کیجئے گا۔" میں نے اس کو روپے دیئے اور اچھی طرح سمجھا بجھا کر واپس آگیا۔

پروفیسر کی اس غلط بیانی پر مجھ کو بڑی حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ اس نے صرف ایاز کی توقیر بڑھانے کے لئے میرے سامنے یہ ڈھونگ رچایا تھا۔ دراصل ایک عرصہ سے ایاز اس کے پاس آیا ہی نہیں تھا اور اب وہ اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا۔ اگر یوں سیدھے سادے طور پر ایاز کو منا لاؤں گا تو ممکن ہے کہ مجسمہ توڑنے والے واقعہ کے باعث میں اس سے لڑ بیٹھوں۔ لہذا پیش بندی کے طور پر یہ سب کچھ کیا تھا۔ بہر صورت یہ بات تو اب بخوبی واضح ہو گئی تھی کہ وہ ایاز سے زیادہ عرصہ تک قطع تعلق نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ اس کی بہت بڑی کمزوری بن چکا تھا۔ اس کمزوری کے پس پردہ کیا راز پنہاں تھا اس کو وہی بہتر جانتا ہوگا۔

دوسرے ہی دن پروفیسر نے پھر ایاز کی باتیں شروع کر دیں لیکن وہ جس قدر اس کے ذکر میں لطف محسوس کرتا مجھ کو وہ اتنا ہی برا محسوس ہوتا۔ البتہ مجھ کو ایاز سے ملنے کا، اس کو دیکھنے اور اس سے بات چیت کرنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ لیکن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اس تمام عرصہ میں ایک بار بھی اس سے مڈبھیڑ نہ ہوئی۔ اس کے لئے

صرف دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں کہ یا تو پروفیسر مجھ کو ایلز سے ملانا نہیں چاہتا یا پھر اس میں محض حادثات کو دخل تھا۔

کوئی ہفتہ بعد کا ذکر ہے۔ اس روز کچھ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ طبیعت کچھ سست تھی اس لئے میں دفتر بھی نہیں گیا۔ تمام دن بستر میں پڑا رہا شام کو جب پڑے پڑے الجھن ہونے لگی تو میں نے کپڑے پہنے اور باہر چلا گیا۔ اسی وقت بارش بند ہو چکی تھی۔ لیکن بادل گھرے ہوئے تھے سڑکوں پر کیچڑ ہو رہی تھی لہذا بازاروں کے چکر کاٹنے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ فوراً ہی واپس جانے کا بھی ارادہ نہ تھا۔ سڑک کے ایک موڑ پر کھڑا میں یہی سوچ رہا تھا کہ اب کیا پروگرام بنایا جائے۔ اسی اثناء میں ایک نوجوان میرے قریب سے گزرتے ہوئے سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظروں سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ مجھ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ آگے بڑھ گیا۔ ذرا دیر میں وہ پھر پلٹا۔ اس دفعہ وہ بالکل میرے قریب آ گیا اور جھجکتے ہوئے بولا۔

"میں نے آپ کو پروفیسر الیاس کے یہاں اکثر دیکھا ہے۔"

میں نے فوراً ہی جواب دیا "آپ نے غلط اندازہ نہیں لگایا۔ میں ان کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔"

وہ بڑی بے تکلفی سے مسکرا کر بولا۔

بھئی یہ کتابیں ان کو دے دیجئے گا۔ بادل گھرے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں آنے جانے میں بارش نے گھیر لیا تو مصیبت آ جائے گی۔

اتنا کہہ کر اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گیا۔ جب وہ کچھ دور چلا گیا تو اچانک میں نے سوچا آیا زترخیں تھا؟ وہی ہوگا۔ بڑا اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ جسم بھی صحت مند تھا۔ میں نے اس کا چہرہ غور سے نہیں دیکھا۔ وہ خوبصورت بھی ہوگا۔ بڑی کوفت ہوئی۔ اس وقت تو بڑی تفصیلی ملاقات ہو جاتی۔

ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا سوچا کہ اگر مل جائے تو اصرار کرکے کسی چائے خانے میں لے جاؤں گا۔ وقت بھی گزر جائیگا اور اس سے ملنے کا جو اشتیاق تھا وہ بھی پورا ہو جائے گا۔ لیکن پوری سڑک میں نے دیکھ لی ہر ایک راہ گیر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، وہ دوبارہ نظر نہ آیا۔

واپس گھر آیا تو بہت تھک چکا تھا لیکن کوٹ اتار کر ہینگر پر ٹانگنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اوپر کی منزل کا دروازہ بڑے زور سے کھلا۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر آگیا۔ پروفیسر بدحواس لکڑی کے زینے پر سے دھم دھم کرکے اتر رہا تھا۔ اس وقت اس کا عجیب حلیہ تھا۔ بال بکھرے ہوئے چہرے پر وحشت ایک ہاتھ کوٹ کی آستین میں اور دوسرا باہر۔ میرے سامنے آیا تو بڑے تیز لہجہ میں بولا۔

تم نے اس حرام زادے کو تو نہیں دیکھا۔ ابھی کھڑکی پر سے کود کر بھاگا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ گھر سے باہر آگئے۔ میں بھی گھبرا کر ان کے پیچھے دوڑا۔ اسی انداز سے بولتا رہا۔ آج اس نے وہ کمینہ پن کیا ہے کہ میں اس کو

زندگی بھر معاف نہیں کروں گا۔ ان کے منہ سے کف جاری تھا اور غصّہ سے آواز لرز رہی تھی۔

"میں اس کو قتل کر دوں گا۔ آج میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس بات پر میں بھی گھبرا گیا۔ معلوم ہوتا ہے آج کوئی سنگین واردات ہو گئی۔ پروفیسر کی حالت دیوانوں کی سی تھی۔ میں نے جلدی سے قریب جا کر پوچھا۔

"پروفیسر صاحب! آخر ہوا کیا! چلئے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

وہ یکبارگی مجھ پر برس پڑے! جی۔ نہیں آپ میرے ساتھ کیوں جائیں گے۔" میں نے ان کی بات کا برا نہیں مانا بہت نرمی سے کہا۔ آپکا تنہا جانا مناسب نہیں۔

"ایک بار میں نے کہہ دیا کہ آپ میرے ساتھ نہیں جا سکتے۔ یہ میرا نجی معاملہ ہے۔ آپ اس میں بولنے والے کون؟" انھوں نے یہ باتیں اتنی زور سے چیخ کر کہیں کہ راہ گیر ٹھٹک کر ہم دونوں کو دیکھنے لگے۔ میں نے سوچا کہ میں نے مزید کچھ کہا تو پروفیسر مجھ سے لڑ بیٹھے گا۔ وہ اس وقت بے حد خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔ لہٰذا میں کچھ کہے بغیر کمرے میں واپس آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں اوپر گیا۔

دیکھنے لگا کہ آج کیا توڑ پھوڑ ہوئی ہے۔ لیکن جب میں وہاں گیا تو ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ موجود تھی۔ ابھی میں کھڑا متجسس نظروں سے کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ لائبریری میں کوئی رو رہا

تھا۔ میں لپک کر وہاں گیا لائبریری میں اندھیرا تھا۔ آتشدان میں تھوڑے سے کوئلے دہک رہے تھے۔ ان کی دھندلی روشنی میں مجھ کو دیوار کے پاس کوئی زمین پر پڑا نظر آیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ لیکن میں نے ابھی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا کہ سسکیوں میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

خبردار جو میرے قریب آئے۔"

یہ عذرا تھی شرمیلی سی سانولے رنگت کی لڑکی۔

تو کیا آج ایاز ——؟ پھر میں نے خود ہی اس خیال کی تردید بھی کر دی ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں ایسا ہی ہوگا۔ ورنہ پروفیسر عظمہ سے اتنا پاگل نہ بن جاتا۔

میں نے فوراً ہی سوئچ دبا کر کمرے میں روشنی کی۔ عذرا دیوار کے قریب اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا لباس کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ چہرہ گھٹنوں میں دبائے سسکیاں بھر کر رو رہی تھی۔ میں نے اس کو بلند آواز دیتے ہوئے کہا۔

"یہ درندگی ہے"

وہ اسی طرح سسکیاں بھر کر روتی رہی۔

میں نے لمحہ بھر رک کر کہا۔ اگر مجھ کو وہ سور کا بچہ ایاز مل جائے تو میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ ایک کمزور لڑکی پر یہ ظلم کرتے ہوئے اس کمینہ کو ذرا سی بھی غیرت نہ معلوم ہوئی۔"

اس نے اس دفعہ گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

" کون ایاز ؟ "

میں چکر میں پڑ گیا۔ ایک بارگی میری زبان سے نکلا۔

" تو کیا پروفیسر ـــــ ؟ " میں جملہ پورا نہ کر سکا۔

اس نے بڑے الھڑپن سے کہا " ہاں۔ " اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حیرت اور استعجاب کا مجھ پر ایسا حملہ ہوا کہ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔

آتشدان میں سلگتے ہوئے کوئلے اب بجھ چکے تھے۔ عذرا کی سسکیاں اب مدھم پڑ چکی تھیں۔ بادل زور زور سے گرجنے لگے تھے۔ بارش شروع ہونے والی تھی۔ میں نے دلاسا دے کر اس کو گھر جانے پر آمادہ کیا۔

گھر سے باہر آ کر اس کے لئے میں نے ایک ٹیکسی لی اور اس کو بٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آیا۔ مجھ کو نہیں معلوم کہ اس نے اپنی اس حالت کے متعلق گھر پر کیا بتایا۔ یوں میں نے اس کو سمجھا دیا تھا کہ وہ رکشا کے ایکسیڈنٹ کا بہانہ بنا کر بات سنبھال سکتی ہے۔ یوں وہ بہت ہی سمجھ دار لڑکی تھی۔ کوئی اور بہتر عذر پیش کر سکتی تھی۔ مجھ کو یقین ہے کہ اس نے پروفیسر کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے صرف اس کے کپڑے نوچ ڈالے تھے۔ یا چہرہ پر اس کے ناخنوں کی ایک آدھ جگہ خراش لگی تھی۔ یہ سب کچھ بالکل اچانک ہوا تھا اسی وقت عذرا کی

چیخ نکل گئی اور وہ وہاں سے چلا آیا۔ کم از کم اس سانولی رنگت والی لڑکی نے مجھ سے یہی بتایا تھا۔

گھر آ کر میں نے دیکھا، پروفیسر ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ میں اوپر جا کر انتظار کرنے لگا۔ دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ آدھی رات گزر گئی۔ ایک بجا، ڈیڑھ بجا، پھر دو باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ کھڑکی کے پٹ بار بار کھڑکھڑا جاتے۔ کمرے کا ماحول بڑا آسیب زدہ سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس وقت نہ میں عذرا کے متعلق غور کر رہا تھا۔ نہ ایاز کے متعلق۔ مجھ کو صرف اس بات کی فکر تھی کہ وہ اب تک واپس کیوں نہیں لوٹا۔ جس وقت دیوار پر لگے ہوئے گھڑیال نے دو بجائے تو بارش اور ہواؤں کے ملے جلے شور میں کسی نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا۔ پروفیسر مر گیا۔ "اس نے خودکشی کر لی۔" پھر جیسے ہواؤں کی چیخوں میں بارش کی بوندوں میں، دریچوں کی کھڑکھڑاہٹ میں یہی بات بار بار ابھرنے لگی۔ میرا جی چاہا کہ میں اٹھ کر یہاں سے بھاگ جاؤں۔

اسی وقت میں نے سنا۔ کوئی باہر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے اوپر کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ بارش بڑی تیز پڑ رہی تھی میں اپنے دروازے پر کھڑی ہوئی کار کو ہی دیکھ سکا۔ آخر میں جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے پروفیسر پانی میں شرابور کھڑا تھا۔ وہ اندر آیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک دبلی پتلی کمسن لڑکی بھی تھی۔ وہ بھی بری طرح بھیگی

ہوئی تھی۔ پروفیسر نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ لیکن میں اس کے ساتھ ساتھ اوپر گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ بری طرح نشہ میں دھت تھا۔

کمرے میں پہنچتے ہی اس نے جیب سے بوتل نکالی۔ پھر ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے جاکر خود ہی دو گلاس اٹھاکر لایا۔ دونوں گلاسوں میں شراب انڈیلی۔ اپنا گلاس تو ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ دوسرا گلاس اس لڑکی کے ہونٹوں سے لگا کر کہا۔ "لوشی ڈارلنگ پیو، کم آن۔" اس وقت اس کی آواز پھٹے ہوئے بانس کی طرح ہو رہی تھی۔ جب وہ گلاس لے کر پینے لگی تو وہ بڑبڑانے لگا۔

"کپڑے، کپڑے تو بھیگ گئے، کوئی بات نہیں۔"

اس نے دیکھتے ہی دیکھتے سارے کپڑے اتار ڈالے اور بالکل برہنہ ہوگیا۔ میں اب تک خاموش کھڑا تھا۔ اب وہاں ٹھیرنا قطعی مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ اس کی ذرا نظر گھومے تو میں جھٹ سے زینے کے دروازے پر پہنچ جاؤں۔

وہ اس لڑکی کے سر ہو رہا تھا کہ وہ بھی کپڑے علیحدہ کردے۔ اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا اور کچھ بے بسی سے میری جانب دیکھنے لگی ـــــ اس وقت پروفیسر نے بھی گھوم کر میری جانب دیکھا۔ اور جھوم کر بڑبڑا: ـ

"تم کون ہو جی، کون ہو، بلڈوٹ" پھر وہ اس لڑکی سے پوچھنے لگا، "یہ کون ہے تم بتاؤ۔"

میں نہ جانے کیوں حماقت میں بول پڑا۔ پروفیسر صاحب! میں ہوں شہیر۔

وہ زور سے چیخا: پروفیسر، کون پروفیسر، میں تو ایاز ہوں ایاز۔ پروفیسر سالا لائبریری میں کتابوں پر پڑا سوتا ہوگا۔ مگر تم نے الو کے پٹھے مجھ کو پروفیسر کیوں کہا۔

"ایاز کیوں نہیں کہتے؟" وہ بری طرح بہک رہا تھا۔ میں باہر جانے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا کہ وہ پھر چلایا۔ "حرامزادے، الو کے پٹھے۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے میرے منہ پر شراب کا بھرا ہوا گلاس کھینچ کر مارا۔

یہ جو میری پیشانی پر صلیب کا سا نشان نظر آرہا ہے یہ اسی چوٹ کا نشان ہے۔ اب چلتے چلتے میں یہ بھی بتا دوں کہ دوسرے دن صبح میں نے دیکھا۔ کہ واقعی پروفیسر لائبریری کے اندر کتابوں پر سر رکھے سو رہا تھا۔ وہ اس وقت بالکل مادرزاد برہنہ تھا۔

⁂

(ایک پُرلطف مباحثہ)

غلطی میری ہی تھی

مباحثہ: —— شوکت تھانوی —— —— "

شوکت :۔ سوال یہ ہے کہ اگر میاں اور بیوی میں صحیح ذہنی رابطہ نہیں تو قصور کس کا ہے ؟

زہرہ :۔ اگر مان لیا تو میاں کا ورنہ بیوی کی قسمت کا۔

شوکت :۔ گویا دونوں صورتوں میں اگر نہیں ہے تو بیوی کا قصور، اس لیے کہ بیوی ہوتی ہے عورت۔ اور عورت نے تاریخِ عالم میں آج تک کبھی اپنے قصور کو قصور نہیں کہا۔ آپ ہی پر منحصر نہیں ہے میں تو اس عورت کے عورت پن کی طرف سے مشکوک ہو جاتا ہوں۔ جو مجھ کو اعتراف کے آس پاس بھی نظر آئے۔ اعتراف کرے وہ عورت ہی کیا ؟

زہرہ :۔ انتظار کر رہی ہوں کہ آپ دم لیں تو میں بھی کچھ عرض کروں۔

شوکت :۔ یہ تو خیر دم دلاسے کی بات ہے۔ بہرحال فرمائیے۔ میں چپ ہوں۔

زہرہ :۔ طے یہ کرنا ہے کہ اپنے رنگ میں کون کس کو رنگے۔ میاں بیوی کو یا بیوی میاں کو؟

شوکت :۔ یہ تو معاملات پر منحصر ہے۔ دونوں میں سے جس کا رنگ چوکھا ہوگا وہی رنگے گا اپنے رنگ میں۔

زہرہ :۔ میں تمام دُنیا کی بات نہیں کرتی۔ اپنی اور میری مثال ہی لیجئے۔

شوکت :۔ چلئے یہی سہی۔ مگر انصاف شرط ہے، خدا کو حاضر ناظر جان کر بتائیے گا کہ میں نے ہمیشہ اپنے کو آپ کی مرضی کے عین مطابق بنانے کی کوشش کی ہے یا نہیں۔

زہرہ :۔ کوشش کریں آپ کے مدعی دشمن۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ میں ہمیشہ آپ کے چشم وابرو کو دیکھتی رہی ہوں کہ آپ کی مرضی کیا ہے۔

شوکت :۔ خیر یہ تو آپ سے زیادہ شاید مجھ کو کرنا پڑتا ہے۔ اگر مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں آپ کے چشم وابرو کی عبادت پڑھنے میں ہمیشہ دھوکا کھاتا ہوں۔

زاہدہ :- دھوکا آپ اس لئے کھاتے ہیں کہ عینک آپ ہی کی ہوتی ہے۔ مرد کی یہی تو زبردستی ہے کہ وہ عورت کی وہی منشا دیکھنا چاہتا ہے۔ جو خود اس کی ہو۔

شوکت :- یہ سراسر اتہام ہے، کم سے کم میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں۔

زاہدہ :- یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی۔ کہ آپ ان مردوں میں سے نہیں ہیں۔ پھر حال ہیں مرد۔ اور مجھ کو تربیت دی گئی ہے کہ میں اپنے آپ کو میاں کی مرضی کے مطابق ڈھالوں۔

شوکت :- ماشاءاللہ۔ تو یہ گویا آپ میری مرضی کے سانچے میں اپنے کو ڈھالا کرتی ہیں۔ جو آئے دن جھک بک جھک جھک رہتی ہے۔ اور جھگڑے کھٹ پٹ رہا کرتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں جب ایسی ہی ایثار پیشہ ہیں تو لڑائی جھگڑا کیسا؟

زاہدہ :- اسی پر تو مجھ کو حیرت ہوتی ہے۔ کہ یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے اور جو کچھ میں سمجھتی ہوں۔ اگر سچ سچ کہہ دوں تو ایک قیامت آجائے گی۔

شوکت :- اچھا دیکھئے یہ آپ کی زیادتی ہے یا نہیں۔ میں کس قدر صلح جویانہ انداز سے باتیں کر رہا ہوں ـــ اور آپ اس کو ایٹم بم سمجھ رہی ہیں۔ اور خواہ مخواہ ہیروشیما بنی جاتی ہیں آپ کے اسی طرزِ عمل نے دنیا جہان میں مجھ کو [illegible] مشہور

کر دیا ہے ۔

زہرہ :۔ اچھا اب دیکھئے برا نہ مانئے گا۔ شاہدہ کی شادی کے تحفے کے فیصلے میں میرا کیا قصور ہے ۔

شوکت :۔ آپ چاہتی تھیں کافی سٹ دینا اور میں چاہتا تھا آئس کریم سٹ دینا۔

زہرہ :۔ شوکت تھانوی ۔

زہرہ :۔ بھلا غور تو کیجئے کہ اس موسم میں آئس کریم کا کون سا وقت تھا۔

شوکت ۔ آپ کو معلوم ہے مجھے کافی کے نام سے وحشت ہوتی ہے ایک پیالی پلا دیکھئے۔ حقہ کا پانی سمجھ کر زہر مار تو کر لوں گا۔ مگر رات بھر خشکی کے مارے نہ نیند آئے گی نہ موت۔

زہرہ :۔ آپ اپنے لئے تو نہیں لے رہے تھے ـــ تحفہ دینا تھا۔ کسی کو۔

شوکت :۔ پھر اس کی کیا ضرورت تھی۔ کہ کافی سٹ دیا جائے۔ زہر خورانی کا سٹ بھی دیا جا سکتا تھا۔ میں تو آئس کریم اس امنگ کے ساتھ لایا تھا کہ آپ اس کے حسین پیالے دیکھ کر جھوم اٹھیں گی۔ میرے انتخاب کی داد دیں گی۔ مگر نہ ہوا آئینہ ورنہ میں دکھاتا کہ کیسا برا منہ بنایا تھا آپ نے اس تحفہ کو دیکھ کر۔

زہرہ :- فرض کر لیجئے کہ وہ مجھ کو ناپسند ہی ہوا تھا — تو بھی کیا آپ کو یہی چاہیئے تھا۔ کہ الٹا کر جو پھینکا ہے اس کا بکس تو ایک ایک کے چھ چھ پیالے بن گئے۔

شوکت :- پھر آخر کہاں تک انسان اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ آپ کو کیا معلوم کہ میں کن راستوں سے گزرتا ہوا بازار تک پہنچا۔ بازار کی کتنی دکانیں جھانکیں۔ مول تول میں کتنا وقت صرف کیا انتخاب میں کس دیدہ ریزی سے کام لیا۔ اور جب ان تمام مرحلوں سے گزرتا ہوا اپنے نزدیک سارے بازار کی جان نکال کر لایا تو آپ کی ایک نگاہِ تحقیر نے میرا تو دل ہی توڑ کر رکھ دیا۔ اور الٹا مجھ پر الزام کہ میں نے سیٹ کیوں توڑا۔

زہرہ :- آپ نے اچھا کیا توڑا۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان یہ اختلافِ خیال ہی کیوں ہوا ؟

شوکت :- ہاں بے شک سوال تو یہی ہے۔ کہ ہم دونوں نے کافی سیٹ یا آئس کریم سیٹ کیوں نہ چاہا۔

زہرہ :- خیر اس قسم کا اختلافِ خیال تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ دونوں کے دماغوں میں کوئی بجلی کا سوئچ تو لگا ہوا نہیں ہے۔ کہ بٹن دبایا اور

ایک ہی قسم کی لاشیں دونوں نے دے دی۔

شوکت:۔ جمیلہ خالہ اور بڑے خالو کو دیکھ لو رشتے میں ایک دوسرے کے میاں بیوی نہیں بلکہ جی ہاں اور جی حضور معلوم ہوتے ہیں۔ میاں نے کہا دن ہے۔ بیوی بولیں بالکل دن ہے۔ یہ تارے تھوڑی ہیں۔ سورج ٹوٹ گیا ہے۔ اس کے ذرّے ہیں۔ بیوی نے کہا آج سردی زیادہ ہے۔ میاں نے پنکھا ہاتھ سے رکھ کر انگیٹھی تاپنا شروع کر دی۔ کوئی مر جائے تو دونوں یا تو کورس میں روئیں گے یا ترتیب کے ساتھ آہیں بھریں گے کیا مجال کر میاں چھیالیس انسو بہائیں تو بیوی پینتالیس بہا کر رہ جائیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کر تعزیتی آنسو قدم ملا کر پریڈ کر رہے ہیں۔

زہرہ:۔ خیر ان کی نہ کہیے۔ ان کے ہاں تو میاں بیوی کے تعلقات ہیں ــــ وہ کشاکشی اور تجارتی لین دین معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہنسی آ جاتی ہے۔ مگر ہمارے یہاں کا قصہ ہی کچھ اور ہے۔

شوکت:۔ وہی تو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ قصہ ہی کیا ہے۔ اِسی کا پتہ چل جائے تو قصہ ہی ختم ہو جائے۔

زہرہ :۔ مجھ میں تو اتنی ہمت ہی نہیں کہ میں اتنا بڑا سچ آپ کے منہ پر بول جاؤں ۔

شوکت :۔ دیکھئے ۔ بیگم صاحبہ آپ کا بس یہی طریقہ زہر لگتا ہے ۔ آپ مجھ سے دراصل ڈرتی ورتی تو خاک بھی نہیں ہیں ۔ اور نہ ڈرنا چاہئے ۔۔۔ مگر ظاہر یہی کرتی ہیں ۔ کہ گویا میں خوفناک درندہ ہوں ۔۔۔

زہرہ :۔ میں آپ سے نہیں ڈرتی آپ کے غصے سے ڈرتی ہوں ۔

شوکت :۔ پھر وہی غصہ ۔۔۔ آپ نے میرے غصے کا وہ ڈھنڈورہ پیٹا ہے ۔ کہ آپ کے میکے کے ایک ایک گھر میں بچے میرے نام سے ڈرائے جاتے ہیں ۔ اور آپ کے ظلم کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں ۔ کہ ایسے بھوت کے ساتھ بے چاری آسیب زدہ لڑکی زندگی کے دن کاٹ رہی ہے ۔

زہرہ :۔ آپ خود دیکھ لیجئے کہ یہ غصہ نہیں تو اور کیا ہے ۔

شوکت :۔۔۔ یہ غصہ ہے ۔ اس کو غصہ کہتے ہیں ۔ خدا کے واسطے میرے حال پر رحم کیجئے ۔ صاحب یہ تو میں اپنا درد دل کہہ رہا ہوں ۔ آپ کی سرکار میں اپیل کر رہا ہوں ۔ اگر یہ بھی غصہ ہے ۔ تو خدا مجھ نامراد کو غارت ہی کر دے ۔

زہرہ :۔ بیچارے کو ساکاٹی شروع ہو گئی۔ بھئی میں نہیں کرتی آپ سے بات آپ ہی سچ کہتے ہیں۔ آپ جیتے میں ہاری۔

شوکت :۔ اجی نہیں ہاریں آپ کے دشمن، ہارا تو میں ہوں۔ جس کی بلند آواز سب سن لیتے ہیں۔ مگر یہ خاموش چٹکیاں کوئی نہیں دیکھتا۔ کہ آپ چپکے سے کیا شوشہ چھوڑ جاتی ہیں۔ غلطی میری ہی تھی کہ میں یہ باتیں کرنے بیٹھا۔ اب کان پکڑے توبہ کی میں نے پھر بابا۔

(ختم شد)